کامٹی کی ادبی تاریخ

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحلؔ

ناشر: بزمِ غالب کامٹی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کامٹی کی ادبی تاریخ

ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل

کتاب کا نام : کامٹی کی ادبی تاریخ
مصنف کا نام : ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل
: محمد علی روڈ مومن پورہ ناگپور
ناشر : بزمِ غالب، کامٹی
سالِ اشاعت : ۱۹۸۲ء
طابع : شمیٰ فائن آرٹس، محمد علی روڈ مومن پورہ ناگپور
کاتب : محمد غلام رسول اشرف، ناگپور

قیمت : ۲۵ روپے

ملنے کا پتہ :
بزمِ غالب، کامٹی (ضلع ناگپور) ۴۴۱۰۰۱ مہاراشٹر

بزرگِ محترم

محمد ظہیر وارثی کے نام

جن کی ذاتِ گرامی

"کامٹی کی ادبی تاریخ" کا سرچشمہ ہے

فہرست

کامٹی کی ادبی تاریخ ، اردو کے نوجوان ، باحوصلہ اور
باصلاحیت محقق ڈاکٹر محمد شرف الدین ساحل کی
تحقیقی کاوشوں کا ثمرہ ہے ۔ یہ دراصل ان کے
تحقیقی مقالے " ناگپور میں اردو " کا ایک حصہ ہے ،
جو غالباً ان کے نزدیک اس لیے اشاعت کی ترجیح کا حق
رکھتا ہے کہ کامٹی ، ناگپور کے مقابلے میں یوں تو
چھوٹا سا شہر ہے لیکن اس کی ادبی تاریخ ، جو ۱۸۸۰ء
سے شروع ہوتی ہے ، اپنی وقعت اور اہمیت کے
لحاظ سے ایک خاص قدر و قیمت کی حامل ہے ۔
کامٹی کو شروع ہی سے ادبی و علمی مرکز کی حیثیت حاصل
رہی ہے ؛ لیکن افسوس کہ ہمارے ادبی مورخوں نے
بوجوہ اس کو عمداً یا سہواً نظر انداز کیا ۔ اس عمد و سہو
کا ازالہ ہی اس کتاب کی تالیف اور اشاعت کا مقصد ہے ۔
کسی موضوع پر تحقیقی نقطۂ نظر کے تحت قلم اٹھانے سے
پہلے متعلقہ موضوع پر مواد کی فراہمی اور جمع آوری

میں جو مسائل اور مشکلات حائل ہوتی ہیں؛ ان کا اندازہ کچھ وہی لوگ کر سکتے ہیں جو اس دشت کی سیاحی میں مبتلا ہوئے ہوں۔ مصنف نے ان کا ذکر بھی کیا ہے اور اس امر کے پیشِ نظر وہ مبارکباد کے مستحق بھی ہیں۔

انھوں نے کامٹی کی ادبی تاریخ قلمبند کرنے سے پہلے شہر کامٹی کی مختصر تاریخ بطور پس منظر بیان کی ہے۔ پھر کامٹی میں شاعری کی ابتدا اور اس کے ارتقائی مدارج کو تفصیل کے ساتھ پیش کیا ہے۔

مجھے یہ دیکھ کر از حد مسرت ہوئی کہ اس مرحلے کو انھوں نے نہایت سلامت روی سے طے کیا ہے۔ افراط و تفریط کا شکار نہیں ہوئے ہیں۔ تطویلِ بے جا سے احتراز اور ایجاز و اختصار کا انداز ان کے طرزِ تحریر کا وطیرہ ہے؛ جس کی بدولت وہ تعریف و تحسین کے بے جا استعمال سے محفوظ اور تنقیصِ ناروا کے اختلال سے مامون رہے ہیں۔

ان کی تحریر علمی متانت سے مملو، سلیس، سہل اور زود فہم ہے۔ رنگینیٔ عبارت کے بجائے ان کی توجہ بیانِ حقائق پر زیادہ مرکوز رہی ہے اور بیان حقائق میں بھی اہم اور بنیادی نکات کو ملحوظ رکھا ہے اور غیر ضروری تفصیلات

سے پرہیز کیا ہے۔

محمد غوث مدراسی (زمانہ ۱۸۸۰ء) سے لے کر عبدالباری عارف (ولادت : ۱۹۵۳) تک کے شعرا و ادبا کی علمی و فنی کاوشوں کا سراغ لگانے میں انھوں نے نہ صرف تحقیقی تقاضوں سے سروکار رکھا ہے بلکہ تنقیدی پہلو بھی نظر انداز نہیں کیے ہیں۔ اس ضمن میں یہ حقیقت ناقابلِ فراموش ہے کہ ہر زمانے میں مختلف اور متضاد رجحان و مزاج رکھنے والے فن کار سانس لیتے رہے ہیں۔

کامٹی میں آج بھی روایتی، ترقی پسند اور جدید فنکار اپنے اپنے مزاج اور استعداد کے مطابق تخلیقی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔ مصنّف نے اس نکتے کو ملحوظ رکھتے ہوئے بڑی کامیابی کے ساتھ متعلّقہ رجحانات کی نشاندہی کی ہے اور اس طرح اپنی ذہنی بے تعصبی کا ثبوت دیا ہے۔

ادبی ماحول سازی اور فضا طرازی میں چھوٹی بڑی علمی و ادبی انجمنوں کا خاص حصہ ہوتا ہے۔ کامٹی کی ادبی سرگرمیاں بالخصوص مشاعرے اپنی ہمہ جہتی کامیابی کے لیے دور دور تک مشہور ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ اہلِ کامٹی کے ذوقِ ادب کی پرورش اسی گہوارے میں ہوئی ہے۔ مصنّف

نے ان انجمنوں اور ان کی ادبی و علمی سرگرمیوں کا
ذکر بھی مناسب طور سے کیا ہے۔ مختصر یہ کہ اس
کتاب میں کامٹی کی ادبی تاریخ کے جملہ پہلوؤں کا
احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جس کی بنیاد
پر مستقبل کا مورخ بجا طور پر کامٹی کو اردو ادب
کی تاریخ میں ایک ادبی مرکز کا مقام عطا کر سکتا ہے
اہلِ کامٹی کو اس کی تالیف و اشاعت کے لیے
مصنّف کا ممنون ہونا چاہیئے۔
انھوں نے کامٹی کا ایک شہری ہونے کے ناطے
چند سطور لکھنے کی دعوت دے کر میری جو عزت
افزائی کی ہے، اس کے لیے میں ذاتی طور پر ان کا
شکر گزار ہوں۔

مدحت الاختر

۱۵ مارچ ۱۹۸۲ء

کچھ اس کتاب کے بارے میں

میرے دل میں ضلع ناگپور کی ادبی، علمی اور صحافتی تاریخ لکھنے کا خیال ۱۹۶۹ء میں پیدا ہوا اور میں نے اس سلسلے میں تلاش و تحقیق شروع کردی؛ اس کے نتیجے میں دو سال کے قلیل عرصے میں میرے پاس نہ صرف کافی مواد اکٹھا ہوگیا بلکہ دو مضامین بھی میرے قلم سے نکلے اور شائع ہوئے، جو ادبی حلقوں میں کافی پسند کیے گئے۔ اس سے میرے عزائم کو تقویت ملی اور میں نے تلاش و تحقیق کی رفتار تیز کردی۔

اس وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ آگے چل کر یہی موضوع میرے پی ایچ ڈی کے مقالے کا عنوان بن جائیگا۔ اس لیے کہ میں ابھی گریجویٹ بھی نہیں تھا۔ بس علاقائی سرفرازی کے جذبے کے تحت اس کام کو انجام دے رہا تھا لیکن ۱۹۷۴ء میں اردو سے ایم اے کرنے کے بعد جب پی ایچ ڈی کرنے کا خیال ہوا تو میں نے بلا تامل اپنا موضوعِ تحقیق ناگپور میں اردو قرار دے دیا اور ڈیڑھ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر دم لیا۔ اس طرح ۱۹۷۷ء میں مجھے ناگپور یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری تفویض ہوئی۔

میرا ارادہ اس کتاب کو جلد از جلد شائع کروانے کا تھا؛ لیکن چند وجوہات

کی بنا پر بیان میر تھی، حیات و شاعری کی تدوین و اشاعت کو اس پر ترجیح دینی پڑی، جب یہ کتاب ۱۹۸۰ء میں چھپ چکی تو "ناگپور میں اردو" کی اشاعت کے متعلق غور کرنے لگا۔ چنانچہ اس مقصد کے تحت اس پر نظر ثانی شروع کر دی لیکن ترمیم و اضافے کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ کتاب کو از سر نو لکھنا پڑا۔ اس سے کتاب کی ضخامت پہلے سے کئی گنا زیادہ ہو گئی؛ لہٰذا اس کو تین حصوں میں تقسیم کر دینا پڑا:

کامٹی کی ادبی تاریخ
ناگپور تاریخ کے آئینے میں
ناگپور میں اردو

پہلا حصہ کامٹی کی ادبی تاریخ چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں پہلے کامٹی کی مختصر تاریخ بیان کی گئی ہے۔ پھر کامٹی میں شاعری کی ابتدا اور اس کے ارتقا سے بحث کی گئی ہے اور ساتھ ہی شاعروں کے مفصل حالات مع انتخاب کلام پیش کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد نثری کارناموں کا جائزہ لیا گیا ہے اور چند منتخب اور نمایندہ نثر نگاروں کے حالات بھی قلمبند کیے گئے ہیں۔ بعد ازاں اخبارات و رسائل اور علمی و ادبی تحریکوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔

ان تمام معلومات کو حاصل کرنے کے لیے مجھ کو کئی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ قدیم اخبارات و رسائل کی ورق گردانی کرنی پڑی، متوفی ادبا و شعرا کے حالات کے لیے ان کے ورثا سے ملنا پڑا اور اس سلسلے میں کئی بزرگوں سے بار بار ملاقاتیں کرنی پڑیں۔ میں ان تمام حضرات کا دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کرتا ہوں، جنھوں نے اس کام میں میری اعانت کی ہے خصوصاً محمد ظہیر وارثی صاحب کا میں بے انتہا مشکور ہوں جنھوں نے اس کام میں قدم قدم پر میرا ساتھ دیا اور مواد کی فراہمی میں نہ صرف

میرے ساتھ کامٹی کے گلی کوچوں میں پریشان حال گھومتے رہے بلکہ موضوع سے متعلق ان کے پاس جو ذخیرہ موجود تھا، وہ بھی مجھے عنایت کر دیا۔ اس حقیقت کا اعتراف ناگزیر ہے کہ اگر موصوف میری رہنمائی اور مدد نہ فرماتے تو یہ کتاب ہرگز مکمل نہ ہوتی۔ میں ایک بار پھر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

کامٹی کی ادبی تاریخ کے سلسلے میں، میں نے مکمل معلومات فراہم کرنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر اس میں کوئی خامی، کمی اور کمزوری نظر آئے تو اسے میری کم علمی اور بے مائگی پر محمول کیا جائے۔

آخر میں بزم غالب کامٹی کے عہدیداران واراکین کا شکریہ ادا کرنا ضروری سمجھتا ہوں جن کی کوششوں سے یہ کتاب زیورِ طبع سے آراستہ ہو سکی ہے۔

یہاں اس حقیقت کا اعتراف بھی انتہائی ضروری ہے کہ عالی جناب سید قمر الزماں، صدر، بزم غالب کی گہری دلچسپیاں ہی اس کتاب کی اشاعت کا سبب بنی ہیں۔ موصوف ایک جواں سال، پرجوش، ملی و سماجی کارکن ہیں اور اپنی ذمّے داریوں کو انتہائی تندہی اور دیانت داری سے انجام دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں مختلف صلاحیتوں اور خوبیوں سے نوازا ہے۔ وہ انگریزی زبان وادب پر اچھا خاصا عبور رکھتے ہیں۔ اردو سے بھی انھیں والہانہ محبت ہے۔

اگرچہ ان کا پیدائشی وطن صوبۂ بہار میں ہے، لیکن ملازمت کے سلسلے میں گزشتہ کئی سال سے کامٹی میں آباد ہیں۔ وہ کامٹی کالری (ضلع ناگپور) میں ایک معزز عہدے پر فائز ہیں۔ اس کے علاوہ اس وقت وہ انڈین نیشنل کونسل آف ینگ مین ورکرس، نئی دہلی کے وائس چیرمین؛ مہاراشٹر انٹک، بمبئی کے آرگنائزنگ سکریٹری، مہاراشٹر پردیش راشٹریہ کوئلہ کھدان کامگار سنگھ (انٹک) ناگپور کے جنرل سکریٹری، انڈین نیشنل مائن ورکرس فیڈریشن (انٹک) کلکتہ کے رکن، جنرل کونسل (انٹک) نئی دہلی

کے رکن، نیشنل آرگنائزیشن آف سنٹرل گورنمنٹ امپلائی (انٹک) ناگپور کے نائب صدر، راشٹریہ ودربھ گرامین مزدور سنگھ ناگپور کے سکریٹری اور سنٹرل کول مائن رسکیو اسٹیشن کمیٹی، دھنباد، بہار میں حکومتِ ہند کی طرف سے نامزد ممبر بھی ہیں۔ غرض اس وقت کامٹی میں ان کی شخصیت بلند مرتبہ ہے اور وہ ہمیشہ فلاح و بہبودی کے کاموں میں پیش پیش رہتے ہیں۔ میں ایکبار پھر ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ والسلام

ناچیز
محمد شرف الدین ساحل
۲۲ فروری ۱۹۸۲ء

محمد علی روڈ،
مومن پورہ ناگپور ۴۴۰۰۱۸

کامٹی کی ادبی تاریخ

کامٹی میں اردو کی آمد

کامٹی شہر ناگپور سے ۱۵ کلومیٹر دور، بمبئی سے کلکتہ جانے والی ریلوے لائن پر واقع ہے
اس کی تاریخ ناگپور کے سیاسی عروج و زوال سے وابستہ ہے۔ اس وقت یہ ناگپور
ضلع کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہے۔
تاریخی لحاظ سے اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جب کلنگ کے بادشاہ کھرویل
نے شات واہن خاندان کے راجہ ستکرنی پر حملہ کیا تو، اس لڑائی میں ستکرنی کو بری طرح
شکست ہوئی۔ یہ دونوں فوجیں لڑتے ہوئے کنہانا ندی (کنہان ندی) تک آگئی تھیں۔
یہ بات اس کتبے سے معلوم ہوتی ہے جو بھونیشور کے قریب اودے گری میں ملا ہے[1]۔
کامٹی اسی ندی کے کنارے آباد ہے۔
مردم خیزی کے اعتبار سے کامٹی کی تاریخ زیادہ قدیم نہیں ہے۔ انیسویں صدی کی ابتدا
میں اس کی آبادی چند گھانس پھونس کے مکانوں پر مشتمل تھی۔ البتہ ۱۸۱۷ء کے
بعد آبادی میں تیزی سے اضافہ ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سیتابلڈی کی لڑائی (دسمبر
۱۸۱۷ء) کے بعد جب انگریزوں نے ناگپور پر سیاسی غلبہ حاصل کرلیا تو ۶ جنوری
۱۸۱۸ء کو بھونسلہ راجہ آپا صاحب اور انگریز ریذیڈنٹ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا

---

1 An Advance History of India by Majumdar. P: 116

جس کے مطابق انگریزوں کو ناگپور اور اس کے اطراف میں فوج رکھنے کا حق حاصل ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے کامٹی میں ایک فوجی چھاؤنی کے قیام کا منصوبہ بنایا اور اس کو عملی شکل دینے کے لیے کرنل جے، ڈبلو، ایڈمس (J.W. Adams) کمانڈنگ دی ناگپور سب سیڈی ایری فورس کی قیادت میں کچھ فوجیں روانہ کیں، جو ۱۲ جنوری ۱۸۲۲ء کو علی الصبح کامٹی پہنچیں اور کنہان ندی کے جنوبی کنارے پر خیمہ زن ہوگئیں[۲]۔ بعد کو ایڈمس کی سفارش پر مستقل فوجی چھاؤنی کا قیام عمل میں آیا۔ اس سلسلے میں ایڈمس نے رچرڈ جینکنس (Richard Jenkins) ریذیڈنٹ ناگپور کو جو خط بھیجا ہے، اس میں اس علاقے کو کیمپتھ (CAMPTAH) لکھا ہے[۳]۔ غالباً یہی لفظ کثرتِ استعمال سے کامٹی (KAMPTEE) ہوگیا ہے۔

کنہان ندی کے کنارے آباد ہونے کی وجہ سے کامٹی صحت بخش اور خوشگوار مقام ہے۔ اسی لیے فوج سے رٹائر ہونے کے بعد زیادہ تر فوجیوں نے یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی اور اس طرح رفتہ رفتہ اس کی شہری آبادی میں اضافہ ہونے لگا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ کامٹی میں مسلمانوں کی آمد انگریز فوج کے ساتھ ہوئی ہے۔ ان مسلمانوں کا تعلق جنوبی ہند سے تھا اور دکھنی ان کی مادری زبان تھی، جو اُس زمانے میں اُردو کے قالب میں اچھی طرح سے ڈھل چکی تھی، لہٰذا یہ بات بلا خوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی میں یہاں اُردو نے اپنا قدم جمانا شروع کردیا تھا۔ لیکن اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد میں ۱۸۵۷ء کے انقلاب کے فوراً بعد زبردست اضافہ ہوا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انگریزوں کے ظلم و ستم سے بچنے کے لیے مشرقی یوپی سے مومن برادری کے

---

۲. Nagpur Residency Record, Vol. IV - P: 189 By H.N. SINHA, (1954)

۳ ایضاً

لوگ ہزاروں کی تعداد میں قافلہ در قافلہ وسط ہند کی طرف چلے آئے اور مختلف علاقوں میں آباد ہو گئے۔ ان میں سے کچھ لوگ کامٹی میں بھی پناہ گزیں ہوئے اور دھیرے دھیرے اس کی آبادی کا ایک مؤثر حصہ بن گئے۔[۴] مسلم آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ یہاں اردو زبان بھی پروان چڑھتی رہی۔ کامٹی میں اس وقت کل آبادی کے تناسب سے ۳۰ فیصد اور مرہٹی آبادی کے تناسب سے ۶۲ فیصد لوگوں کی مادری زبان اردو ہے۔

۴ : مجلّہ علم و عرفان (انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری کامٹی)
مضمون کامٹی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی تاریخ از محمد ظہیر وارثی، ص: ۶

شاعری کا آغاز وارتقا

اب تک جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ کامٹی میں اردو بولنے والوں کی آمد کا سلسلہ ۱۸۲۲ء کے بعد شروع ہوا اور دن بدن ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ افسوس! ہمارے سامنے کوئی ایسا ثبوت نہیں ہے، جس کی مدد سے یہ اندازہ لگایا جاسکے کہ انیسویں صدی کی تیسری دہائی سے لیکر ۱۸۵۷ء تک یہاں شعروادب کی رفتار کیا تھی؟ البتہ ۱۸۵۷ء کے بعد اس سرزمین سے جو شعرا ابھرے ہیں ان کے متعلق تفصیلی معلومات فراہم ہوجاتی ہیں اور ان کا کلام بھی مل جاتا ہے۔

ابتدائی دور کے شعرا میں صرف محمد غوث مدراسی کا نام بزرگوں کے حافظے میں محفوظ رہ گیا ہے۔ انتہائی کوششوں کے بعد بھی ان کے کلام کا نہ تو کوئی نمونہ مل سکا اور نہ ہی ان کی زندگی کے حالات معلوم ہوسکے۔ بس یہ بات ادبی حلقوں میں کافی مشہور ہے کہ وہ سعید کامٹوی کے استاد تھے اور اس زمانے کے کچھ اخبارات ورسائل میں ان کا کلام بھی چھپا ہے۔ اب تک کی تحقیق کے مطابق یہی کامٹی کے پہلے شاعر ہیں۔

یہ بات پوری ذمے داری سے کہی جاسکتی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے بعد جو لوگ کامٹی میں آباد ہوئے، بعد کو انہی کی نسل سے اعلا پائے کے عالم، شاعر، ادیب اور دانشور پیدا ہوئے۔ مولانا حافظ محمد شکر اللہ رح (۱۸۳۲ - ۱۹۰۸ء) پہلے بزرگ

ہیں، جن کی تدریسی خدمات سے علمی و ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ وہ غازی پور (ضلع اعظم گڑھ) سے کامٹی آئے تھے۔ پارچہ بافی کی صنعت سے اپنی روزی روٹی کا سامان مہیا کرتے تھے۔ عربی، فارسی اور دینی علوم کے جیّد عالم تھے۔ چنانچہ اپنے کرگھے کے اطراف گھانس پھونس کی چٹائیاں بچھا کر درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا اور متعدد لوگوں کو علم کی دولت سے مالا مال کیا۔ ان میں حاجی ملّا عبدالوارث، منشی سعید، حافظ محمد ابراہیم خلیل، حافظ محمد عبداللہ حافظ، محمد اسحٰق اسحٰق، محمد منیف اللہ فیض، عبدالقادر اخگر، عبدالرحمٰن اخضر، عبدالمجید آغا کے اسمائے گرامی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

ان بزرگوں نے کامٹی میں علم و ادب کی جو خدمات انجام دی ہیں، ان کو فراموش کرنا ناممکن ہے۔ خصوصاً سعید نے شعر و سخن کو حد درجہ تقویت پہنچائی اور اس کا تذکرہ کوچہ و بازار میں عام کر کے علمی و ادبی تحریکات کا مرکز بن گئے۔ کامٹی کے ان تمام شعرا نے انہی کے سامنے زانوے تلمّذ تہہ کیا ہے، جو بعد کو خود استادی کے مرتبے تک پہنچے۔ اس اعتبار سے عبدالقادر اخگر، عبدالرحمٰن اخضر اور مولانا یار محمد انور قابل ذکر ہیں۔ آج یہاں جتنے شعرا موجود ہیں، ان کا تعلق انہی اساتذہ سے ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے جبکہ میرٹھ سے ماہنامہ جلوۂ یار اپنی پوری آب و تاب کیساتھ شائع ہو رہا تھا۔ اس میں ہر ماہ مصرع طرح دیا جاتا تھا اور شعرا سے طبع آزمائی کی درخواست کی جاتی تھی۔ چونکہ اساتذہ کی کوششوں سے کامٹی میں اچھا خاصا شاعرانہ ماحول قائم ہو چکا تھا لہٰذا وہاں جلوۂ یار کے خریداروں کی تعداد کافی ہو گئی تھی۔ اس وقت شعرا کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ یہی تھا کہ وہ جلوۂ یار میں دئے گئے مصرع طرح پر طبع آزمائی کیا کرتے اور غزل کو اشاعت کیلئے بھیج دیتے، جو رسالے میں اعزاز کیساتھ شائع کی جاتی۔ اس کا ایک اچھا نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوانوں میں شعر گوئی سے دلچسپی بڑھنے لگی اور ان کے عزائم بلند ہوتے چلے گئے۔

اسیطرح سفینۂ نجات، دہلی میں، جو نعتیہ کلام پر مشتمل رسالہ تھا، ہر ماہ دو طرحی مصرعے دئے جاتے۔ اس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے شعرا کا کلام چھپتا تھا۔ کامٹی کے

شعرا کو بھی اس میں مناسب جگہیں دی جاتی تھیں ۔ میرے خیال میں اساتذہ کی کوششوں کے علاوہ ان دونوں پرچوں نے بھی کامٹی کے شعری ماحول کو جاندار اور پُرجوش بنانے میں انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے ۔ اس سے ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اس زمانے کے شعرا کے کلام کا کچھ حصّہ محفوظ ہو گیا ۔ ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ چند شعرا کے علاوہ باقی کا کلام تباہ و تلف ہو چکا ہے ۔

بلاشبہ ان دونوں پرچوں کی بدولت کامٹی میں شعر و شاعری کو کافی ترقی ملی اور نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اس طرف مائل ہوئی ۔ ان رسائل کے مطالعے سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ اس دور میں کامٹی کے یہ شعرا ایک نمایاں مقام رکھتے تھے ۔ حافظ محمد عبداللہ حافظ تلمیذ شوکت میرٹھی ؛ محمد بیچو برق ؛ حافظ عبدالشکور قلزم تلمیذ حافظ خلیل ؛ محمد عبدالرحمٰن انور تلمیذ حافظ خلیل ؛ عبدالقادر اخگر تلمیذ سعید ؛ عبدالرحمٰن اخفر تلمیذ سعید ؛ عبدالشکور شریف (سردار پنچ) ؛ محمد فیض اللہ فیض تلمیذ سعید ؛ محمد سراج الدین سراج تلمیذ سعید ؛ عبدالمجید آغا تلمیذ سعید ؛ محمد اسحٰق اسحٰق تلمیذ سعید محمد رستم احقر تلمیذ سعید ؛ مولانا عبدالرشید رشید تلمیذ سعید ؛ منشی ابوبکر شہرت تلمیذ مولانا ناطق گلاؤٹھوی ؛ محمد عبدالرحیم جوہر تلمیذ حافظ ؛ عبدالرحمٰن رحمٰن پولس ہیڈ کانسٹبل تلمیذ برق ؛ محمد شیر نادان تلمیذ برق ؛ محمد یحییٰ یحییٰ تلمیذ برق ؛ محمد اسمٰعیل راقم تلمیذ برق ؛ محمد بیکا نو بیدل تلمیذ برق و ناطق ؛ محمد ابراہیم حرّاق و خلیل تلمیذ برق و ناطق ؛ محمد عمر آتش تلمیذ قلزم ؛ عبدالباری ارمان تلمیذ برق ؛ محمد اسداللہ راحت تلمیذ حافظ عبدالکریم شیخ کریم بخش عادل تلمیذ نور محمد عین ؛ محمد حنیف حنیف تلمیذ اخگر ؛ میر سید احمد زیبا تلمیذ اخگر ؛ قادر شریف احقر تلمیذ اخگر ؛ دین محمد ارمان تلمیذ اخگر ؛ محمد عبدالحفیظ آتش تلمیذ اخگر ؛ اور محمد حبیب اللہ انور تلمیذ اخگر وغیرہ ۔ ان میں بیشتر شعرا کے تفصیلی حالات فراہم ہو چکے ہیں ۔ باقی کے حالات کافی کوششوں کے باوجود بھی اب تک نہیں مل سکے ہیں ۔ اس کا شدید افسوس ہے ۔

اس دور میں کامٹی کے شعرا نے زیادہ تر نعتیں اور غزلیں کہی ہیں ۔ کچھ شاعروں نے تاریخ گوئی کی طرف بھی توجہ کی ہے ۔ دیگر اصناف خال خال نظر آتی ہیں ۔ غزل سے بے اعتنائی

شعرا کے لیئے ایک ناممکن امر ہے ، اسی لیے کم وبیش ہر شاعر نے اس کو اپنی فکر کا مرکز بنایا۔
اب رہا سوال نعت گوئی کا ، تو اس سلسلے میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ اس زمانے میں جتنے شعرا کامٹی کی سرزمین سے ابھرے ، اُن پر مذہبی اثرات غالب تھے ۔ دوسری وجہ سفینۂ نجات کے طرحی مصرعوں پر مسلسل طبع آزمائی تھی ۔ اِن وجوہات کی بنا پر نعتیہ شاعری کا دامن مالامال ہوگیا ، یہاں تک کہ سعید نے ۱۳۰۹ھ (۱۸۹۰ع) میں اپنی نعتوں کا ایک مجموعہ 'فروغِ جاوید' شائع کروایا ۔ بعد کو حافظ عبدالشکور قلزم نے کامٹی کے چند شعرا کے علاوہ اس وقت کے مشہور نعت گو شعرا کی منتخب نعتوں کا ایک مجموعہ 'جامِ کوثر' کے عنوان سے ترتیب دیکر ۱۹۰۶ع میں مجتبائی پریس لکھنؤ سے چھپوایا ۔ اس میں کامٹی کے شعرا میں مولانا حافظ محمد ابراہیم خلیل ، منشی سعید ، اخگر ، عبدالرشید رشید ، حافظ محمد ابراہیم حافظ محمد سلیمان اختر ، محمد صدیق صدیق ، محمد عبدالرحمٰن انور ، محمد فیض اللہ فیض ، محمد اسحٰق آسحٰق محمد سراج الدین اطہر ، محمد عبدالحفیظ آتش اور عبدالرحمٰن اخضر کا نعتیہ کلام شامل ہے ۔ اس کتاب کا تاریخی نام نوید پیغمبر (۱۳۲۴ھ) ہے[۱]۔ کامٹی میں ۱۹۲۰ع تک نعتیہ شاعری عروج پر نظر آتی ہے ۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ اس سے دلچسپی کم ہوتی چلی گئی اور اب تو یہ حال ہے کہ اس طرف شعرا کا رجحان بالکل نہیں ہے ۔
تاریخ گوئی کی ابتدا سعید نے کی ۔ بعد کو عبدالمجید آغا اور محمد رستم احقر نے اس میں نمایاں مقام حاصل کیا ۔ موجودہ زمانے میں یہ صنف شاطر حکیمی ، عزیز قدوسی ، انیس آغائی اور تابش حلیمی کی وجہ سے زندہ ہے ۔ ان شعرا کے نکالے ہوئے تاریخی مادے انتہائی صاف ستھرے اور معنی خیز ہیں ۔
ادبی اعتبار سے اس دور کی نعتوں اور غزلوں میں کوئی انفرادی خوبی نظر نہیں آتی ۔ بلکہ وہی اندازِ فکر پایا جاتا ہے ، جو لکھنؤ اسکول کا طرۂ امتیاز رہا ہے ۔ خارجی مضامین کی کثرت مضمون آفرینی اور معنی آفرینی وغیرہ ۔ لب ولہجہ اور زبان وبیان میں بھی وہی طرز موجود ہے ۔
لیکن بیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی کے بعد جو شعرا سامنے آئے ان کے یہاں

۱۔ جہدِ پیہم (سوونیر ینگ مسلم فٹ بال کلب ناگپور) 'مضمون گونڈوانہ کا ادب نواز طبقہ' از ابو محمد ابراہیم خلیل

پاکیزگی و لطافت اور داخلی مضامین کی کثرت ملتی ہے ۔ کلام میں جوش و جذبات کیساتھ ساتھ بھرپور تاثر بھی پایا جاتا ہے ۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی کوشش مولانا انور نے کی ہے، جو منشی سعید کے شاگرد تھے ۔ ان کا کلام انتہائی صاف ستھرا، لطیف اور متانت و سنجیدگی لیے ہوئے ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے کامٹی میں غزل گوئی کو ایک نیا موڑ دیا اور اس میں داخلی مضامین کو جگہ دیکر اسے خارجیت سے پاک و صاف کیا ہے ۔ بعد کو ان کے تلامذہ نے ان کی تقلید کی اور اپنی غزلوں میں اسی اندازِ فکر کو سمیٹنے کی کوشش کی ۔ شاطر حکیمی، اعجاز اور راہی اس لحاظ سے قابل ذکر ہیں ۔ مولانا انور کے بعد سوز خضرائی نے غزلوں میں اور زیادہ وسعت اور کشادگی پیدا کی ۔ انہوں نے تغزل کے علاوہ دیگر موضوعات کو بھی اس میں جگہ دی ۔ حیات و کائنات کے مسائل کو سمو کر اسے جاندار اور پُراثر بنایا ۔ آگے چل کر اثر کریمی اور تابش حلیمی وغیرہ نے اس روش کو اختیار کیا ۔ اس دور میں نظر رشیدی کا اندازِ فکر سب سے نرالا ہے اُن کے کلام کا لب و لہجہ اور آہنگ منفرد ہے ۔ انہوں نے اپنی شاعری کی اساس دنیا کی معاشی بدحالی اور عصر حاضر میں پیش آنے والے حوادث و واقعات پر رکھی ہے ؛ اس لیے ان کا رنگ علحٰدہ ہو گیا ہے ۔ جب نئی شاعری کا دور شروع ہوا تو مدحت الاختر اور عبدالرحیم نشتر نے اس لہجے کو اپنایا اور ملک گیر شہرت حاصل کی ۔ بعد کو اقبال اشہر اور غیور جعفری نے یہی لہجہ اختیار کیا ۔ اس طرح فی زمانہ کامٹی میں ہر طرز اور لہجے کی نمائندگی کرنے والے شعرا موجود ہیں ۔

کامٹی میں نظم نگاری کی ابتدا بیسویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوئی ۔ محمد طالب الدین طالب پہلے شاعر ہیں جنہوں نے غزلوں کے ساتھ ساتھ نظمیں بھی کہی ہیں ۔ چونکہ اس وقت شعرا کا رجحان غزل گوئی کی طرف تھا اس لیے نظم نگاری کا چلن عام نہ ہو سکا ۔ لیکن جب سعید کے ایک شاگرد صفی اللہ عادل نے غزل گوئی سے انحراف کر کے نظم نگاری کی طرف توجہ دی تو کچھ شعرا کی فکر و نظر میں نمایاں تبدیلیاں ہوئیں ۔ اور انہوں نے غزلوں کے علاوہ نظمیں بھی کہنا شروع کیں ۔ اس لحاظ سے عبدالرحیم مضطر، سوز خضرائی، شاطر حکیمی، اور شمس کے

اسمائے گرامی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان شعرا کے یہاں کافی تعداد میں نظمیں ملتی ہیں؛ جن میں عصر حاضر کی جھلکیاں اور قوم وملت کے نام پیغام موجود ہے۔
اب شعرا کے تفصیلی حالات ملاحظہ کیجیے:

سعید : ——— محمد سعید

ان کے والد محمد عبداللہ (سرپنچ انصار برادری) ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے دو سال بعد مئو (ضلع اعظم گڑھ) سے نقلِ مکانی کر کے کامٹی چلے آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ سعید ۱۸۶۰ء میں کامٹی میں پیدا ہوئے۔
انہوں نے اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم حافظ محمد شکر اللہ سے حاصل کی۔ بعد کو ذاتی کوششوں سے اِن زبانوں میں اچھا خاصا ملکہ حاصل کر لیا۔ وہ بہت شریف، خلیق اور ملنسار تھے۔ زہد وتقویٰ کے پابند تھے۔ سلسلۂ طریقت میں مولانا شاہ عشرت بدخشانیؒ (ف ۷ صفر ۱۳۲۸ھ) کے مرید تھے۔ قومی اور سماجی کاموں میں پُرجوش حصہ لینے کی وجہ سے کنٹونمنٹ بورڈ کے ممبر نامزد کیے گئے، جو اس زمانے میں ایک بڑا شہری اعزاز تھا۔ جب ۱۹۲۷ء میں کامٹی میونسپل کمیٹی کا قیام عمل میں آیا تو اس کے ممبر مقرر کیے گئے۔
انہوں نے اس علاقے میں علوم دینیہ کی ترویج واشاعت کے لیے ۱۹۱۷ء میں سردار حاجی عبدالرحمٰن (ف ۲۷ دسمبر ۱۹۲۸ء)، ملا عبدالوارث (ف ۳ دسمبر ۱۹۴۲ء) اور حافظ محمد داؤد (ف یکم جون ۱۹۳۵ء) کے تعاون سے مدرسہ سراج المومنین قائم کیا، جو اب تک جاری ہے۔ ان کی وفات ۱۱ اپریل ۱۹۳۰ء (۲۵ ذیقعدہ ۱۳۴۸ھ) کو جمعرات کے دن ہوئی۔ مسلم قبرستان کامٹی میں محوِ خوابِ ابدی ہیں۔ تجمل جلالپوری نے تاریخِ وفات کہی ہے[1]:

گیا بست و پنجم کو ذیقعدہ کی ‎ ‎ ‎ ‎ جہاں سے سخن سنج جادو بیاں

۱۔ یہ قطعہ سعید کے پوتے ڈاکٹر انیس خورشید سے فراہم ہوا ہے۔

تجھے ڈھونڈتی ہیں نگاہیں سعید کہاں ڈھونڈیں ہم تجھ کو پائیں کہاں

تجمل کہو بہرِ سالِ وفات

"ہے باغِ جناں میں وحیدِ زماں" ۱۳۴۸ھ

انہوں نے دو بیٹے اپنے پیچھے یادگار چھوڑے تھے۔ بڑے بیٹے محمد خورشید حق ایک اچھے منتظم اور سیاست داں تھے۔ انہوں نے ۱۹۶۳ء میں کامٹی میں رحلت فرمائی دوسرے بیٹے سردار محمد یوسف، کامٹی میں اپنے آبائی مکان میں سکونت پذیر ہیں۔ خورشید حق کے بیٹے تقسیم ملک کے بعد پاکستان چلے گئے، جہاں وہ معزز عہدوں پر فائز ہیں۔ ان کے بڑے بیٹے ڈاکٹر انیس خورشید بین الاقوامی شہرت کے مالک ہیں موصوف لائبریری سائنس میں مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی انگریزی میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ خورشید حق کی چھوٹی بیٹی نئی شاعری کے ممتاز شاعر شاہد کبیر سے بیاہی ہے۔

سعید کو طالب علمی کے زمانے میں جب شاعری کا شوق پیدا ہوا تو منشی محمد غوث مدراسی ثم کامٹوی سے اصلاح لی۔ ان کے بعد حاجی تجمل حسین تجمل جلالپوری سے مشورہ کیا۔ اس طرح ان کا سلسلۂ تلمذ مصحفی لکھنوی پر منتہی ہوتا ہے۔ تجمل، سعید سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔ وہ ان کی دعوت پر ۱۹۱۰ء میں کامٹی تشریف لائے اور یہاں کئی دنوں تک مقیم رہے۔ اس اثنا میں ان کے گرد اچھا خاصا ادبی حلقہ قائم ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک شعر میں کہتے ہیں:

ناطق، سعید، اخگر، صوفی، مجید، اخضر
یاد آتے ہیں تجمل، احباب کامٹی کے

یہ سعید ہی تھے، جنہوں نے کامٹی میں شعر و ادب کو تقویت پہنچائی اور اس کا تذکرہ عام کیا۔ کامٹی کے اُن تمام شعرا نے جو بعد کو خود استادی کے مرتبے تک پہنچے، انہی سے استفادہ کیا ہے۔ ان کا کلام پیام یار (لکھنؤ)، جلوۂ یار (میرٹھ) اور سفینۂ نجات (دہلی) میں کثیر تعداد میں چھپا ہے۔ ان کے دو دیوان فروغ جاوید

اور ارمغان جدید چھپ چکے ہیں۔ فروغِ جاوید (۱۳۰۹ھ) نعتیہ کلام پر مشتمل ہے اور مطبع کریمی بمبئی سے ۱۸۹۰ء میں چھپا ہے۔ دیوانِ سعید المعروف بہ ارمغانِ جدید (۱۳۱۳ھ) میں ۱۶۴ غزلیں اور تائب و تجمل کی ایک ایک غزل پر تضمین موجود ہے۔ یہ دیوان، جو ۱۱۲ صفحات پر محتوی ہے، ۱۸۹۵ء میں انوار محمدی پریس، لکھنؤ سے شائع ہوا ہے۔ اس کے آخری صفحے پر تائب اور تجمل کی دیوان کی اشاعت پر کہی گئی تاریخیں درج ہیں۔ ان کے مقطعے دیکھیے:

طلب کی جو تائب نے تاریخِ طبع
لگا کہنے ہاتف "براتِ سخن" ۱۳۱۳ھ

تجمل نے لکھی تاریخ اس کی
"خیابانِ سعیدِ نیک کردار" ۱۳۱۳ھ

انہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے والہانہ محبت تھی۔ اس لیے شاعری کی ابتدا نعت گوئی سے کی۔ ان کی نعتیہ غزلیں حرارتِ ایمان سے پُر ہیں۔ اشعار میں حقائق و معارف ملتے ہیں۔ بعد کو ان کی طبیعت غزل گوئی کی طرف مائل ہو گئی اور زندگی کے آخری ایام تک اسی صنف کو اپنے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنائے رکھا۔ لکھنو اسکول سے وابستگی کے باعث ان کی غزلیہ شاعری میں لکھنوی رنگ غالب ہے۔ ان کے یہاں معنی آفرینی اور خارجی لوازمات کثرت سے ملتے ہیں۔ شوخی، خواہشِ وصل لاگ ڈانٹ، طعن و تشنیع اور چھیڑ چھاڑ سے اُن کی غزلیں مملو ہیں۔ صاحب فن اور کہنہ مشق شاعر ہونے کی وجہ سے کلام میں پختگی، روانی، برجستگی، زبان کی صفائی اور بیان کی سادگی ملتی ہے۔ جلوۂ یار میرٹھ میں مطبوعہ ایک غزل کے چند اشعار دیکھیے[2]:

یہ تنہائی میں، اپنے جی کے بہلانے کا ساماں تھا   نظر میں دلربا، پہلو میں دل اور دل میں ارماں تھا

۲۔ جلوۂ یار میرٹھ، اکتوبر نومبر ۱۹۱۰ء، ص: ۲۱

نہ دیتا میں جو اپنی جان گھبرا کر تو کیا کرتا
کہ ٹلنا تیرا دشوار اے بلائے شام ہجراں تھا

دکھائی تم نے شکل اپنی تو سب کچھ مل گیا مجھ کو
نہ کوئی اور حسرت تھی، نہ کوئی اور ارماں تھا

جہاں والے ہمیشہ جستجو میں جس کی رہتے تھے
بسا تھا وہ مرے دل میں، مری آنکھوں میں پنہاں تھا

نہ وقتِ نزع وہ آئے، نہ دل کی آرزو نکلی
سعید ان کو ذرا ہم دیکھ لیتے بس یہ ارماں تھا

اب ان کے مجموعۂ کلام ارمغان جدید سے چند اشعار درج کیے جاتے ہیں :

کس عروسِ گل کی شادی گلشنِ عالم میں ہے
آج آتی ہے صدائے نغمہ ہائے عندلیب

میں نے مانگی تھی دمِ صبح خدا سے جو دعا
آ گیا شام سے وہ رشکِ قمر آپ سے آپ

ہم اٹھائے نہ اٹھیں گے ترے در سے ہرگز
بیٹھ جائیں گے جو نقشِ کفِ پا کی صورت

ہے عجب حسرت کا منظر بندھ گئی ہے ٹکٹکی
دیکھتے ہیں وہ ہمیں اور ان کو ہم رخصت کے وقت

ہے سنگِ جور و ظلم سے دونوں کا ایک حال
دکھلائیں دل کی چوٹ تمہیں یا جگر کی چوٹ

وصل اس راحتِ جاں کا کبھی ہو جائیگا
اے سعید! اتنا رہا کرتے ہو دلگیر عبث

بھولے سے تم کو یاد نہ کرتے ہوں وہ سعید
آتی ہیں ہچکیاں جو تمہیں بار بار آج

کشتہ کیا کسی کو، کسی کو کیا شہید
آئی مگر نہ تم کو مروت کسی طرح

چمنِ حسن میں کی دست درازی کس نے
آج اترا ہے کسی غیرتِ گلزار کا رخ

اب کریں کس پہ جفا، اہلِ وفا میرے بعد
نام کو بھی نہ رہا، نامِ جفا میرے بعد

نہ کوئی پھول گلستاں میں کھلا میرے بعد
بندھ گئی بادِ مخالف کی ہوا میرے بعد

مجھ سا پاؤ گے نہ تم بندۂ ارشاد کوئی
یاد آئیگا بتو! تم کو خدا میرے بعد

ہائے لکھنا تھا کچھ احوالِ تمنائے وصال
بھر دیا شکوۂ اغیار سے سارا کاغذ

تنگ آئیں ہیں ہم گردشِ تقدیر سے لیکن
جائینگے کہاں چرخ کے چکر سے نکل کر

باقی ہے وہی شرم و حیا آج بھی ان کی
ہیں دور کھڑے مجمعِ محشر سے نکل کر

افسوس رہی قدرِ محبت نہ مرے بعد
سودا ہوا ناکام مرے سر سے نکل کر

ہمیں سے نفرت کہ دور بیٹھو، مؤدب و باشعور بیٹھو
بٹھاؤ غیروں کو بے تکلف، قریب اپنے بلا بلا کر

دید کو تیرے ترستے ہیں تری محفل کے پاس
اے یمِ خوبی کھڑے ہیں تشنہ لب ساحل کے پاس

وہ جس خطاب سے فرمائیں یاد، میں خوش ہوں
نہ آپ کہنے سے ہے مدعا، نہ تُو سے غرض

لکھ لکھ کے بھیجتے ہیں ہمیشہ ادھر سے خط
آتا نہیں جواب ہیں لیکن اُدھر سے خط

کب تلک وصل کے ارمان میں ترسوں آخر
اے صنم! آج مجھے بہرِ خدا کر محظوظ

پیری میں ہے یہ حال چراغِ حیات کا
محفل میں جیسے وقتِ سحر جھلملائے شمع

لو لگائی ہے جو اس نورِ ازل سے ان دنوں
دل کو حاصل ہو گیا شمعِ شبستاں کا فروغ

پیشوائی کے لئے بادِ بہاری آگئی
جب چلا وہ رشکِ گل گھر سے گلستاں کی طرف

ستا رہا ہے جو تو آسمانِ کج رفتار
ہماری جاں کے لیے کم نہ تھی بلائے فراق

عدو کا دعویِ الفت غلط ہو
اگر آجائے نوبت امتحاں تک

ہمراہ میرے غیر کو دی بزم میں جگہ
اے رشکِ گل لگے ترے اس سادہ پن میں آگ

تم نہیں مجھ سے خفا ہو کرتے ہیں تسلیم ہم
کیوں نہیں پہلی سی پھر چشمِ عنایت آجکل

پھر ہم سنائیں گریہ و زاری کا اپنے حال
پھر مسکرا دے ناز سے قربان جائیں ہم

دام گیسو کا تو صیاد نے پھیلایا ہے
بلبلِ دل کو گرفتار کروں یا نہ کروں

ہائے کیا ان سے میں حالِ دلِ بیمار کہوں
ناتوانی سے نہیں تابِ تکلم مجھ کو

کیوں تڑپ کر جان دیدی صبر کرنا تھا تجھے
چار دن کے بعد، اے بلبل بہار آنے کو تھی

مر گیا تیشہ لگا کر کوہکن، کیوں اتنی جلد
خود بخود شیریں تو سوئے کوہسار آنے کو تھی

لے چلا بلبل کو کیسے وقت میں صیاد آہ
منہ ابھی کھولے تھے غنچوں نے بہار آنے کو تھی

جانتے پہلے اگر انجامِ الفت اے سعید
روکتے اپنی طبیعت کو ہزار آنے کو تھی

ہائے انصاف پسند اپنی اجل بن نہ گئی
اس طرف ہوتی ہوئی جانبِ دشمن نہ گئی

میری الفت نے بنایا تم کو معشوقِ جہاں
میں ہوا شیدا تو تم پر خلق شیدائی ہوئی

حسرت و غم جلد نکلو دل سے استقبال کو
یادِ جاناں کی سواری ہے قریب آئی ہوئی

آکے، گھر سے میرے وہ رشکِ مسیحا پھر گیا
ہائے تن سے جان پھر جاتی رہی آئی ہوئی

دیکھ لینا، ہم مٹائیں گے خطِ تقدیر کو
گر میسر یار کے گھر کی جبیں سائی ہوئی

اس گلِ رعنا کی آمد کی خبر سن کر سعید
پھرتی ہے بادِ صبا گلشن میں اترائی ہوئی

بیڑیاں پانو میں، ہاتھوں میں پڑیں زنجیریں
اے جنوں ! اور تو باقی نہیں زیور کوئی

بیاں کچھ اور جل جل کر اب پروانہ کرتا ہے
بہا کر اشک شمعِ انجمن کچھ اور کہتی ہے

گلِ تر سے نزاکت میں تو ہم تشبیہہ دیتے ہیں
مگر رخسارِ جاناں کی پھبن کچھ اور کہتی ہے

شرابِ وصل کا ساغر نہیں ملتا جو فرقت میں
جگر کی اے سعید! اب تو جلن کچھ اور کہتی ہے

دل لے اڑا ہے خاک میں دزدِ حنا ملے
اللہ میرے چور کو پوری سزا ملے

جی بھر کے اپنا حالِ مصیبت اسے سنائیں
ہم کو جہاں میں گر کوئی دردآشنا ملے

دشمن کو روسیاہ کہا، کیا برا کیا
تل بھر بھی ہو قصور تو مجھ کو سزا ملے

خلیل : ـــــــ محمد ابراہیم

خلیل، حافظ محمد شکر اللہ کے مایۂ ناز شاگرد تھے۔ انہوں نے متداول علوم انہی سے سیکھا۔ عربی فارسی میں اچھی مہارت رکھتے تھے۔ حافظِ قرآن تھے۔ انہیں مذہبی کتابوں کا گہرا مطالعہ تھا۔ قوتِ حافظہ اتنی زبردست تھی کہ احادیث کا ایک بڑا حصہ یاد ہو گیا تھا۔ تبحرِ علمی کا یہ عالم تھا کہ بڑی بڑی کتابوں کا درس زبانی دیا کرتے۔ وہ مدرسہ اسلامیہ کامٹی میں مذہبی علوم کے مدرس تھے۔ متعدد لوگوں نے ان سے

اکتساب علم کیا ہے۔ ابھی جوانی کے دور سے گزر رہے تھے کہ ۱۹۰۴ء میں طاعون کی وبا نے گھیر لیا اور وہ جاں بحق ہو گئے۔ ان کے چہیتے شاگرد عبدالشکور قلزم نے تاریخ کہی ہے

جو کی حافظ نیک خو نے قضا   ہوئی صدمۂ غم سے حالت تباہ

جہاں میں اب استاد ایسا کوئی   ملے گا نہ شاگردوں کو خیر خواہ

سر آہ سے لکھ دو قلزم یہ حال

ہوئے داخل خلد جاوید آہ

۱۳۲۱ھ

اپنے پیچھے جسمانی یادگار میں ایک لڑکا محمد اسمٰعیل چھوڑا تھا، جو ۱۹۷۶ء میں فوت ہوا۔ محمد اسمٰعیل کے بیٹے حافظ محمد اشرف اب ناگپور میں رہتے ہیں۔ افسوس! کلام مہیا نہ ہو سکا۔

برق : ـــــــ محمد بیچو

ان کا خاندان مئو (ضلع اعظم گڑھ) کا رہنے والا تھا۔ ان کے والد الٰہی بخش تلاش معاش میں کامٹی آئے اور یہیں آباد ہو گئے۔ بہت ہی نیک اور شریف النفس تھے۔ انیسویں صدی کی آخری دہائی میں وفات پائی۔ ان کے دو بیٹے تھے: محمد بیچو اور محمد بیکالو۔ ان دونوں کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اول الذکر کا تخلص برق اور ثانی الذکر کا تخلص بیدل تھا۔

برق ۱۸۶۵ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم مشرقی طرز پر ہوئی۔ علمی استفادہ حافظ محمد شکراللہ سے کیا ہے۔ پوری زندگی رخت سازی سے اپنے جسم و جان کو یکجا رکھنے کا ساز و سامان مہیا کرتے رہے۔ ۱۹۲۶ء میں رحلت فرمائی۔ ان کے دو لڑکے حفظ الکریم اور رحمن زندہ و سلامت ہیں۔

ان کا شمار اساتذۂ سخن میں ہوتا ہے۔ کئی شاعروں نے ان سے فیض اٹھایا ہے اور کلام پر اصلاح لی ہے۔ وہ درویش صفت انسان تھے۔ صوم و صلوٰۃ کے بے حد پابند تھے۔ میلاد خوانی پر عبور رکھتے تھے۔ اصناف سخن میں نعت، غزل، مرثیہ اور سلام کثیر

تعداد میں کہا، لیکن یہ تمام شعری سرمایہ ان کی لاپرواہی کی نذر ہوگیا۔ سفینۂ نجات میں کچھ نعتیہ کلام ملتا ہے۔ یہ انتخاب اسی سے نقل کیا جارہا ہے:

نہ ہو غمگین اتنا، دل تو سن کر حال محشر کا | وسیلہ ہے، بھروسا ہے، ہمیں اپنے پیمبر کا
جو کچھ تھا حال میرا وہ تو پہلے ہو چکا روشن | کروں پھر آپ سے میں کیا گلہ اپنے مقدر کا
ہوا ہے عشق پیدا دل کو جب سے اس شہِ دیں کا | اڑا جاتا ہوں یثرب کو کبوتر بن کے بے پر کا
رہیں تم کو مبارک حور و غلماں حضرتِ زاہد | مجھے دیدار ہو جائے شفیعِ روزِ محشر کا
میں جاؤں سر کے بل ہندوستاں سے جانبِ طیبہ | ستارہ اوج پر آئے اگر میرے مقدر کا

رسول اللہ کی حق نے عجب صورت بنائی ہے
نہیں ہمتا دو عالم میں کوئی محبوبِ داور کا[1]

ہوگیا مقبول درگاہِ خدا میں وہ بشر | جو ثنا خوانِ جنابِ صاحبِ لولاک تھا
حسنِ یوسف پر ہوئی عاشق زلیخا ہی فقط | خود فدائے مصطفےٰ تم پر خدائے پاک تھا
میں گدا تو ہوں، ولیکن اس درِ دولت کا ہوں | ہفت کشور کا خزانہ جس کے آگے خاک تھا

بس طفیلِ پنجتن یہ مرتبہ مجھ کو ملا
ورنہ از حد برق تو لاعلم بے ادراک تھا[2]

قلزم : ——— عبدالشکور

حاجی الٰہی بخش (ف ۱۹۲۶ء) ہینڈلوم کپڑوں کے ایک بڑے تاجر گزرے ہیں۔ وہ مئو (اعظم گڑھ) سے کامٹی آئے۔ بہت مخیر اور احباب نواز تھے۔ مساجد و مدارس کے کاموں میں خصوصاً پرجوش حصہ لیا کرتے۔ اسی لیے ان کا نام بہت مشہور ہوگیا تھا۔

۱۔ سفینۂ نجات مارچ ۱۹۰۲ء، ص: ۱۱

۲۔ ایضاً ص: ۷

قلزم انہی کے حقیقی بھتیجے تھے ۔ لاولد ہونے کی وجہ سے انہوں نے قلزم کو اپنے بیٹے کی طرح پالا اور ان کی تعلیم و تربیت کا اچھا انتظام کیا۔ قلزم نے حافظ محمد ابراہیم خلیل کی نگرانی میں قرآن مجید کا حافظہ کیا۔ بعد کو مدرسہ اسلامیہ کامٹی میں، جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی تھی، طلبہ کو دینی تعلیم دینے لگے۔

انہیں مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ اس لیے زیادہ تر نعتیں کہی ہیں۔ ان کا بڑا کارنامہ جام کوثر کی تدوین و اشاعت ہے۔ عین عالم شباب میں، ۱۹۰۷ء میں طاعون سے انتقال کیا۔

نمونۂ کلام دیکھیے :

ارادہ[1] ہے یہ مدت سے مرے طبعِ مطہر کا — کوئی مضمون تازہ ہو رقم نعتِ پیمبر کا
غلامی سیدِ کون و مکاں کے در کی کافی ہے — نہیں محتاج میں یارب کسی کے مال اور زر کا
پریشاں حال، مضطر ہم جو پہنچے دشتِ کعبہ میں — ہوا غل آرہا ہے دیکھو دیوانہ پیمبر کا
ہے دامانِ شفیع المذنبیں سایہ فگن سر پر — نہیں کچھ خوف ہم کو گرمیِ خورشیدِ محشر کا

فراقِ شاہ میں لب سے جو آہِ آتشیں نکلے
ابھی قلزم ہو جل کر خاک دل چرخِ ستمگر کا

مرتبہ[2] وہ ہے گدائے احمدِ مختار کا — جس کے آگے ہیچ ہے رتبہ ہر اک زردار کا
کیا کروں ظلِ ہما لے کر میں اے سلطانِ دیں — بس کفایت ہے مجھے سایہ تری دیوار کا
گر پڑے اوندھے زمیں پر خوف سے لات و منات — جب بجا ڈنکا عرب میں احمدِ مختار کا

پیچ و خم قلزم مقدر کا مرے جاتا رہا
جب ہوا نظارہ زلفِ سیدِ ابرار کا

جسے[3] عشقِ شاہِ ہدا کا نہیں ہے — وہ مقبول بندہ خدا کا نہیں ہے
زر و مال، عشقِ پیمبر ہے قلزم — خدا کا دیا پاس کیا کیا نہیں ہے

۱۔ سفینۂ نجات مارچ ۱۹۰۲ء، ص : ۶
۲۔ ایضاً اگست ۱۹۰۲ء ص : ۴
۳۔ ایضاً ستمبر ۱۹۰۲ء ص : ۱۵

اُس رہ کی خاک سرمۂ نایاب ہے مجھے
جس راہ سے نبی ترے زوّار آئے ہیں[۴]

رشید : ـــــــ عبدالرشید

کافی کوششوں کے باوجود حالات فراہم نہ ہو سکے۔ ان کی کچھ نعتیں سفینۂ نجات میں چھپی ہیں۔ اسی پرچے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ابوالاعجاز ان کا لقب تھا اور وہ سعید کے شاگرد تھے۔ مرغوب القلوب کے عنوان سے ان کی ایک کتاب شائع ہو چکی ہے جو اب نایاب ہے۔ منشی نولکشور پریس کی قدیم فہرست کتب میں بھی اس کتاب کا نام ملتا ہے۔ جسمانی یادگار میں ایک بیٹی تھی، جو محمد فیض اللہ فیض سے بیاہی تھی۔ اس نیک خاتون کا انتقال ۹۶ سال کی عمر میں اکتوبر ۱۹۸۱ء میں ہوا۔[۱]

چند شعر دیکھیے:

جلوۂ روئے پیمبر جب نمایاں ہو گیا ۔۔۔ ماہ ششدر ہو گیا خورشید حیراں ہو گیا
میں جو گرمی سے قیامت کی پریشاں ہو گیا ۔۔۔ دامنِ لطفِ نبی سر پر نمایاں ہو گیا
جب سمائی وحشتِ تفریحِ صحرائے عرب ۔۔۔ باغِ ہندوستاں مرے حق میں نیستاں ہو گیا
دیکھنا جاؤں گا میں بھی اے فلک سوئے عرب ۔۔۔ میری قسمت کا ستارہ گر فروزاں ہو گیا

خوف کیا پھر پرسشِ اعمال کا اس کو رشید
لطفِ احمد جس کا محشر میں نگہباں ہو گیا

جب بجا ڈنکا جہاں میں سیدِ ابرار کا ۔۔۔ خوف سے لرزاں ہوا دل لشکرِ کفار کا
گو سراپا جرمِ عصیاں سے ہوں اے زاہد بھرا ۔۔۔ ہے مگر مجھ کو بھروسہ رحمتِ غفار کا[۲]

۴۔ سفینۂ نجات ۔ نومبر ۱۹۰۲ء، ص: ۶
۱۔ سفینۂ نجات ۔ جون ۱۹۰۲ء، ص: ۴
۲۔ ایضاً ۔ اگست ۱۹۰۲ء، ص: ۱۳

لشکرِ کفر و ضلالت خوف سے تھرا اٹھا　　دیکھ کر جوہر، نبی کے دین کی تلوار کا
دولتِ دارین سے دل کیوں نہ ہو میرا غنی　　عشق ہے مجھ کو جنابِ سیّدِ ابرار کا

کیوں نہ اک عالم کہے پھر حافظِ قرآں رشید
میں ثنا خواں ہوں نبی کے مصحفِ رخسار کا

اخگر : ــــــ عبدالقادر

اخگر، سعید کامٹوی کے چچازاد بھائی، عبدالوارث کے اکلوتے بیٹے تھے۔ عبدالوارث اگرچہ اپنے خاندان کے ساتھ کامٹی میں رہتے تھے لیکن انھیں تجارت کے سلسلے میں چند سال امراؤتی میں بھی گزارنے پڑے۔ وہیں ۱۸۰۷ء میں اخگر پیدا ہوئے۔

ان کے والد ایک اچھے تاجر تھے۔ انھیں علم و ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کے برعکس، ان کی والدہ علمی لحاظ سے کافی سوجھ بوجھ رکھتی تھیں۔ چنانچہ جب وہ بڑے ہوئے تو اس نیک خاتون نے ان کی تعلیم و تربیت میں حد درجہ دلچسپی لی اور حافظ محمد شکراللہ کے مکتب میں داخل کر دیا۔ وہاں انھوں نے قرآن کریم کے علاوہ فارسی اور اردو کی کئی کتابیں پڑھیں، یہاں تک کہ ان زبانوں میں اچھی خاصی مہارت حاصل کرلی۔

والد کے انتقال کے بعد گھر کی ذمہ داری ان پر آپڑی۔ ان کے یہاں اعلا پیمانے پر پارچہ بافی کا کاروبار ہوتا تھا۔ انھوں نے اس کی پوری دیانتداری اور تندہی سے نگرانی کی، جس سے اس میں وسعت و کشادگی پیدا ہوگئی۔ انھوں نے ہمیشہ ایک خوش حال زندگی گزاری اور اپنے ساتھ اپنے بال بچوں کو بھی ہر فکر سے آزاد رکھا۔ ان کا انتقال ۵ فروری ۱۹۶۰ء کو ہوا مسلم قبرستان کامٹی میں دفن کیے گئے۔ قطعۂ تاریخ وفات شاطر حکیمی نے کہا ہے:

عظمتِ شہر تھا اک سخن گو　　رہ گیا وہ بھی خاموش ہو کر
سرد ہے محفلِ شعر و حکمت　　نہ رہا اخگرِ نکتہ پرور ۱۹۶۰ء

ان کی پہلی شادی ان کے رشتے کے چچا حافظ جمال الدین کی صاحبزادی شکورن بی سے ہوئی تھی۔ ان کے بطن سے چار لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئیں۔ اس خاتون کے انتقال کے بعد آدرہ (اڑیسہ) کے رئیس محمد سبحان کی بیٹی کریما بی (ف ۱۹۴۲ء) سے نکاح کیا۔ ان سے تین بیٹے اور تین بیٹیاں ہوئیں۔ اس وقت ان کے بیٹوں میں منشی محمد مختار، عبدالکریم انصاری عبدالحلیم ثانی، مشتاق احمد خلش قادری اور ممتاز احمد قادری زندہ ہیں۔ عبدالحلیم ثانی ادب و شعر کا لطیف ذوق رکھتے ہیں۔ ناگپور کی مشہور ادیبہ ڈاکٹر زرینہ ثانی انھی کی اہلیہ تھیں۔

اخگر صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے۔ سلسلۂ طریقت میں مولانا سید فضل رحمٰن گنج مرادآبادی کے خلیفہ مولانا سید احمدؒ دہلوی سے بیعت تھے۔ انھیں ۱۹۲۹ء میں حج کا شرف حاصل ہوا۔ اصول کے اس قدر پابند تھے کہ مومن برادری کے سردار کی حیثیت سے فیصلہ کرتے وقت اپنے قریبی رشتہ داروں کو بھی جرم کی حالت میں سزا کا مستحق ٹھہرانے میں پس و پیش نہیں کرتے تھے۔

گھر کے شاعرانہ ماحول نے انھیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ کلام پر اصلاح سعید سے لی اور ان سے اس فن کے متعلق بہت کچھ سیکھ کر خود استادی کا درجہ حاصل کر لیا۔ کلام "جلوۂ یار" میں شائع ہوا ہے۔ کچھ نعتیہ کلام سفینۂ نجات میں چھپا ہے۔ انھوں نے اگرچہ اپنی زندگی میں کافی تعداد میں غزلیں، قصائد، نعت، مراثی اور سلام کہے، لیکن ان کی حفاظت کی طرف سے بالکل غافل تھے۔ اسی غفلت کی وجہ سے ان کا پورا کلام تباہ ہو گیا۔ وہی باقی رہ گیا ہے جو جلوۂ یار میں شائع ہو چکا ہے۔ یہ چند شعر اسی سے منتخب کیے گئے ہیں:

چھیڑتے رہتے ہیں ہر وقت وہ اغیار کی بات — ہر گھڑی مجھ سے کیا کرتے ہیں تکرار کی بات
دلِ بیتاب کو ہو جاتی ہے تسکیں اخگر — ہم سے کر لیتے ہیں جو وقت وہ کچھ پیار کی بات

۱۔ جلوۂ یار جون ۱۹۰۹ء، ص: ۶

۱ شبِ فرقت میں او ظالم تصور تیرا آ آ کر
دلِ بیتاب میں لیتا رہیگا چٹکیاں کب تک

۲ کسی کے پھول سے رخسار پہ جس دن سے شیدا ہوں
میں کانٹے کی طرح چشمِ عنادل میں کھٹکتا ہوں
بتاؤ کب کیا ہے آپ نے وعدہ وفا مجھ سے
جو کہتا ہوں تمہیں میں بیوفا کیا جھوٹ کہتا ہوں
گزرتی ہے اسی فرقت میں اخگر رات فرقت کی
کبھی خاموش رہتا ہوں کبھی فریاد کرتا ہوں

۴ ہم لاجوابِ عشق ہیں، وہ لاجوابِ حسن
ان کا جواب ہے نہ ہمارا جواب ہے

۵ کافی ہے مرے قتل کو ابرو کا اشارہ
گر ہاتھ میں اس شوخ کے تلوار نہیں ہے
اخگر انھیں تم آئینہ لے جا کے دکھا دو
کہتے ہیں کوئی مجھ سا طرحدار نہیں ہے

۶ چلے، چل کر رکے، پھر کچھ چلے، پھر رک گئے چل کر
خرام نازِ جاناں ہے کہ خنجر کی روانی ہے

۷ جنوں کے جوش میں نکلے تھے گھر سے
ادھر سے ہم چلے، پتھر ادھر سے

اخضر : ـــــ عبدالرحمٰن

ان کے والد شیخ عیدو ٹانڈہ (ضلع فیض آباد) سے ۱۸۵۷ء کے بعد کامٹی آئے۔ یہیں ۱۸۸۵ء میں اخضر پیدا ہوئے۔ انھوں نے قرآن کریم کا ناظرہ اور اردو فارسی کی تعلیم حافظ محمد شکر اللہ سے حاصل کی۔ ان کے لڑکپن اور نوجوانی کے ایام انتہائی خوش حالی میں گزرے اور جب تک ان کے والدین زندہ رہے، وہ معاش کی فکر سے بالکل آزاد تھے۔ لیکن کارکنانِ قضا و قدر کو ان کی یہ خوش حالی منظور

۲۔ جلوۂ یار ۱۹۱۵، ص : ۱۳
۳۔ ایضاً دسمبر ۱۹۱۰، ص : ۵
۴۔ محترم عبدالحلیم ثانی کے شکریے کے ساتھ
۵۔ جلوۂ یار جون ۱۹۱۰ء، ص : ۵
۶۔ محترم محمد ظہیر وارثی کے شکریے کے ساتھ
۷۔ ایضاً

نہ تھی چنانچہ والدین کے انتقال کے بعد معاشی پریشانیوں کا بری طرح شکار ہو گئے۔ رخت سازی کی وہ صنعت جس پر زندگی کی خوش حالی کا انحصار تھا' برباد ہو گئی۔ ایسی حالت میں کثیر الاولادی ایک جرم ثابت ہوئی۔ تصور کیا جا سکتا ہے کہ انھیں اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے کن کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہوگا۔ اُن کے اطمینان و سکون کو غارت کرنے کے لیے یہ حادثات ہی کیا کم تھے کہ ۱۹۲۶ء میں ان کی چہیتی بیوی نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اب گویا ان کی دنیا تاریک ہو گئی اور اس غم کو بھلانے کے لیے شراب پینے لگے۔ آگے چل کر اس عادت نے اتنا زور پکڑ لیا کہ ہر وقت اسی کے نشے میں چُور رہا کرتے۔

قدرت جب کسی انسان کی خوش حالی کو بدحالی سے یا بدحالی کو خوش حالی سے بدلنا چاہے تو اسے کون روک سکتا ہے۔ مسلسل پریشانیوں کے دور سے گزرنے کے بعد جب اخضر کے سعادت مند بیٹے جوان ہو گئے تو ان لڑکوں نے کسی طرح جوڑ جماؤ کر کے اینٹ سازی کا کاروبار شروع کیا۔ اس میں خدا نے اتنی برکت دی کہ عسیر الحالی' فارغ البالی میں تبدیل ہو گئی۔ یہاں سے اخضر کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی۔ اب انھوں نے شراب سے رشتہ توڑ کر خدا سے رشتہ جوڑ لیا۔ پھر کیا تھا؟ حج کی سعادت کا شرف بھی حاصل کیا اور باقی زندگی عبادت و پرہیز گاری میں گزاری اور اسی عالم میں ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۶ء کو اپنی جان' جان آفریں کے سپرد کی۔ آخری خواب گاہ' مسلم قبرستان کامٹی میں ہے۔ ہاشم رحمانی نے تاریخِ وفات کہی' جو روزنامہ انقلاب (۷ نومبر ۱۹۶۶ء) میں چھپی ہے:

یہ مصرعِ تاریخ ہے اخضر کی غزل کا
"تنہائی میں کرنا ہے کوئی بات خُدا سے" ۱۹۶۶ء

اخضر نے طالب علمی کے دور میں شعر کہنا شروع کیا۔ ابتدا میں حافظ محمد ابراہیم خلیل سے مشورہ رہا۔ ان کے بعد سعید سے اصلاح لی اور ان سے بہت کچھ سیکھا۔ سعید نے ایک انجمن قائم کی تھی' جس کے زیرِ اہتمام اکثر ڈرامے ہوا کرتے۔ اخضر ان ڈراموں میں بھرپور حصہ لیتے۔ وہ ڈرامائی انداز میں مشاعروں میں اپنا کلام بھی سُناتے تھے۔ کئی معیاری رسائل میں ان کی غزلیں چھپی ہیں۔ افسوس! دیوان شائع نہ ہو سکا حالانکہ شعری سرمایہ

ان کے بیٹوں کے پاس محفوظ ہے ۔ اب نمونۂ کلام دیکھیے :

عالم نہ پوچھیے، شبِ غم اضطراب کا — آنا محال ہو گیا آنکھوں میں خواب کا

میں جاں بہ لب ہوں، ساقیِ بہوش کی یاد میں — ٹپکا دو حلق میں کوئی قطرہ شراب کا

ہے آرزوے وصل بتِ خود پسند سے

دیکھو تو حوصلہ دلِ خانہ خراب کا

سرِ شوریدہ جب سوے بیاباں لے چلا ہم کو[2] — گریباں پھاڑ کر تار گریباں نکلے ماتم کو

وفا میری رُلائیگی انہیں، جب یاد آؤنگا — ابھی تو دیکھ کر ہنستے ہیں میری بزم ماتم کو

یہ مشتِ خاک، تھی اکسیر، لیکن کب سمجھ آئی — زمیں میں کر دیا تم نے سپردِ خاک جب ہم کو

اکیلے طور پر موسیٰ کو کیا دکھلا دیا تو نے — جو صورت ہی دکھانی تھی، دکھاتا سارے عالم کو

کسی بدبخت کے عقدہ کشا کیوں ہوں وہ اے اخضر!

جو خود سلجھا نہیں سکتے ہیں اپنی زلفِ برہم کو

لے کے قاصد سے خطِ شوق ہمارا اس نے[3] — آگ میں ڈال دیا آگ بگولا ہو کر

عمر بھر صحتِ بیمار کا رونا ہی رہا، — کچھ بنائے نہ بنی تم سے مسیحا ہو کر

کرتے ہیں پورا وعدۂ دیدار اس طرح — دکھلاتے ہیں جمال وہ، آ آ کے خواب میں

تصوّر کو قفس میں قید کر سکتا نہیں کوئی

چمن کا رہنے والا فطرتاً آزاد ہوتا ہے

میرے ان کے درمیاں اک حدِ فاصل تھا رقیب — بارے فرصت مل گئی لیکن بڑی گھس گھس کے بعد

بساطِ دہر پہ تھا صرف تیرا عکسِ جمال — حقیقتاً تو کسی وقت بے حجاب نہ تھا

ہو گیا اور ہی کچھ بزمِ جہاں کا نقشہ — کر دیا درہم و برہم تری انگڑائی نے

۱۔ جلوۂ یار اپریل ۱۹۱۹ء، ص : ۷

۲۔ شاعر (آگرہ) نومبر دسمبر ۱۹۳۳ء، ص : ۱۵

۳۔ یہ اشعار ان کی قلمی بیاض سے لیے گئے ہیں ۔

پوچھا جو کسی نے مجھے جھنجھلا کے وہ بولے
اخضر جسے کہتے ہیں وہ مرتا ہے ہمیں پر

خدا حافظ ہے جو انجام ہوگا دیکھا جائیگا — ہم آغازِ محبت کی ابھی بنیاد رکھتے ہیں

ہو ہم سخن وہ تم سے شامت ہو جسکی آئی — جادو بھرا ہوا ہے اندازِ گفتگو میں

تمھیں بتاؤ فسانہ غم کا سناؤں اپنا کہاں سے پہلے — کہ سامنے پھر نہ آئے جھگڑا یہاں سے پہلے وہاں سے پہلے

دلے کم بخت تصور بھی آتا ہے غضب — نیند بھی آتی نہیں شب کو سحر ہونے تک

جب ملو تم ہنسی خوشی سے ملو — اور اخضر کا مدعا کیا ہے

بے حس پڑا ہوا ہوں میں مانندِ سنگِ راہ — تیری نظر سے گر کے ملی یہ سزا مجھے

سکھاتی ہے کسی کی بے نیازی ناز برداری
تغافل سے محبت اور محکم ہوتی جاتی ہے

شمع کی ضو سے محبت ہے تو یہ کیا معنی؟ — خودکشی کرنا ہے جائز کہاں پروانے کو

وحشت نے میرے گھر کا بُرا حال کر دیا — سر پیٹتا ہوں دیکھ کے دیوار و در کو میں

اِدھر آنکھیں لہو روتی ہیں فرطِ انتظاری میں
اُدھر معذور بیٹھے ہیں، وہ پابندِ حنا ہو کر

بڑا اچھا ہوا خونِ تمنا کر دیا تم نے — کہاں تھی اس قدر رنگین دل کی داستاں پہلے

چمن کا ہر مصور رنگِ معنی بھر نہیں سکتا — بڑی حکمت سے کھینچی ہیں گل و بلبل کی تصویریں

تم دیکھ لو بس میری طرف ناز و ادا سے — جس طرح بنے گا میں نپٹ لوں گا قضا سے

یہ دیکھ رہا ہوں کہ چھٹے مجمعِ محشر — تنہائی میں کرنی ہے کوئی بات خدا سے

اس شاہدِ رعنا کی بھی اللہ رے نزاکت — سر پھر گیا گلزار میں پھولوں کی ہوا سے

دل لیتے ہی رہتے ہیں یہی شغل ہے ان کا — انداز سے، غمزے سے، کبھی ناز و ادا سے

اخضر اسی دنیا میں محبت کی بدولت
تم دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گئے کیا سے

حافظ : ـــــ محمد عبداللہ

حافظ کے دادا خان محمد مئوناتھ بھنجن (ضلع اعظم گڑھ) سے کامٹی آئے۔ ان کے دو بیٹے تھے : دین محمد اور غلام محمد۔ یہی غلام محمد، حافظ کے والد تھے۔ ان کا انتقال جوانی میں ہوا۔ ان کے بھی دو بیٹے ہوئے : محمد عبداللہ (حافظ) اور عبدالرحمن۔ بڑے دین محمد اپنے زمانے میں کامٹی میں ہینڈلوم کپڑوں کے سب سے بڑے تاجر تھے۔ خدا نے انھیں اچھی عزت اور کافی دولت سے نوازا تھا۔ چنانچہ چھوٹے بھائی کے انتقال کے بعد اپنے بھتیجوں کی دیکھ بھال اور تعلیم و تربیت کا معقول انتظام کیا۔

حافظ ۱۲۹۶ھ (۱۸۷۸ء) میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی کی تعلیم حافظ محمد شکر اللہ سے پائی۔ انھیں کی نگرانی میں قرآن مجید کا حفظ کیا۔ تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ذاتی مکان میں مکتب قائم کرکے درس و تدریس میں مصروف ہو گئے۔ یہ سلسلہ وفات تک جاری رہا۔ دعا، تعویذ اور عملیات میں بھی مشہور و معروف تھے۔ انھوں نے ۱۷ فروری ۱۹۷۲ء (یکم محرم الحرام ۱۳۹۲ھ) کو جمعرات کے دن رحلت فرمائی۔ تدفین مسلم قبرستان کامٹی میں عمل میں آئی۔ یونس افسر نے تاریخ کہی ہے :

باسرِ افسوس ہے تاریخِ مرگ
جانبِ خلدِ بریں حافظ گئے　　۱۹۷۲ء

اولاد میں چار بیٹے : ظہیر الحسن، حبیب الرحمن، محمد کبیر انصاری، حافظ محمد نذیر بقیدِ حیات ہیں۔

وہ اپنے زہد و اتقا کے لیے ممتاز اور نیکی و شرافت کا پتلا تھے۔ ہر کوئی ان کا احترام و اکرام کرتا۔ انھیں ۱۹۵۲ء میں مومن برادری کا سرپنچ مقرر کیا گیا تھا۔

شاعری میں سعید کے ہم عصر تھے۔ کلام پر مجدد السنۂ شرقیہ مولوی احمد حسن شوکت میرٹھی (ف دسمبر ۱۹۲۲ء) سے اصلاح لیا کرتے۔ اس کا ثبوت ان اشعار سے ملتا ہے :

مسلکِ فن میں تھی مجھکو شیخِ کامل کی تلاش — حضرتِ شوکت سے میرا مدعا پورا ہوا
شکر صد شکرِ خدائے ذوالمنن حافظ مجھے — مل گیا شوکت سا رہبر یہ بہت اچھا ہوا

اپنی زندگی میں دیوان مرتب کر لیا تھا، جو اُن کے بیٹوں کے پاس محفوظ ہے۔ اس کا سائز ۶×۸ اور ضخامت ۱۲۸ صفحات ہے۔ یہ کالی روشنائی سے خطِ نستعلیق میں تحریر ہے۔ اس میں دو حمد، اکتیس نعت، ایک نعتیہ مسدس، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ کی شان میں ایک منقبت اور ۸۰ غزلیں ردیف وار درج ہیں۔

کلام کے مطالعے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ وہ بسیار گو تھے اور اپنی قابلیت کا سکہ بٹھانے کے لیے مشکل سے مشکل زمینوں میں طبع آزمائی کرتے۔ ان سے مشکل ہی سے کوئی قافیہ چھوٹا ہوگا۔ اس لیے ان کے یہاں عموماً کافی طویل غزلیں ملتی ہیں۔ کلام میں لکھنوی رنگ غالب ہے، یعنی وہی خارجیت جو لکھنؤ اسکول کا طرۂ امتیاز رہی ہے۔

غزلوں کا مختصر انتخاب یہ ہے:

بہ جز خیالِ بتِ بے وفا تجھے حافظ — خیال اور شبِ انتظار کب ہوگا
کیا پوچھتے ہو کون جہاں سے گزر گیا — جو تھا خدنگِ ناز کا زخمی وہ مر گیا
بن گیا دُرِّ عدن آنسو ٹپک کر آنکھ سے — برگِ گل پر گر کے گوہر قطرۂ شبنم ہوا
دل داغہائے ہجر سے میرا ہے باغ باغ — نظارہ کر رہا ہے ارم کی بہار کا

بے وفا سے عبث اُمیدِ وفا تھی حافظ
دوست سمجھے تھے جسے ہم وہی دشمن نکلا

اللہ رے نازِ اُن کا سوالِ وصال — دیتے ہیں کس ادا سے وہ منہ پھیر کر جواب

شر اگر تجھ سے ہو پیدا مجھ سے الفت کا ثمر
شمع روشن ہے اگر تو میں بھی ہوں پروانہ آپ

ٹکٹکی باندھ کے دیکھا کیے مجھ کو شب بھر — دیکھتا میں بھی رہا اُن کی برابر صورت
زخمِ جگر کو میرے تو اے چارہ گر نہ چھیڑ — رہتی ہے ہر گھڑی تجھے فکرِ رفو عبث
زلفِ شمیم کھل گئی کس رشکِ ماہ کی — پھیلی ہے بوئے مشک نسیمِ سحر سے آج

شاید گزر ہے دشت میں شعلہ رخوں کا آج
پر وحشیوں کے جلتے ہیں پروانے کی طرح

تیغِ نگاہِ یار نے وہ وار کی کہ ہاں
زخمِ جگر بنے ہیں مثالِ انارِ سرخ

سیراب ہم ہیں شربتِ دیدارِ یار سے
کب آئے ساقیا ترا جام و سبو پسند

اسیرِ زلف کو، شیدائے روئے جاناں کو
عزیز شام اُسے ہے، اِسے سحر ہے عزیز

نہ ہوا وصل میسر، نہ ہوئی وصل کی بات
مفت بدنام ہوئے عاشقِ شیدا ہو کر

حسن پر کیوں ناز ہے شمس و قمر کو اس قدر
منھ چھپالیں گے ابھی وہ روئے تاباں دیکھ کر

مرے رونے پہ وہ ہنس کر مرے دشمن سے کہتے ہیں
توجہ تو ذرا فرماؤ ان کے چشمِ گریاں پر

لے لیا عقل و خرد بھی، دین بھی، ایمان بھی
کچھ نہ چھوڑا حور وش نے قلبِ پُر ارماں کے پاس

دھڑکتا ہے دلِ مضطر، کلیجہ منھ کو آتا ہے
درازیِ شبِ غم کی سنائیں داستاں کب تک

خود یار مرا پھول ہے، میں پھول ہوں، میرا
تن پھول، بدن پھول، دہن پھول، ذقن پھول

دیکھ کر چشمِ حسینانِ جہاں کا سرمہ
جم گیا منزلِ خورشید کی چھت پر کاجل

میرے زخموں پر نمک پاشی اگر منظور ہے
ایک چٹکی سے ہو کیا، لے لو نمکداں ہاتھ میں

مسخر کر لیا اس کو نظر بھر کر جسے دیکھا
عجب انداز کا جادو ہے چشمِ شعبدہ گر میں

میں لکھ رہا ہوں موئے کمر کی نزاکتیں
ڈر ہے کہ بیٹھے بیٹھے ہی دردِ کمر نہ ہو

خلوت میں بھی بوقتِ تکلم ادا کے ساتھ
نیچے جھکائے رہتے ہیں گردن حیا کے ساتھ

بجا ہے، عاشق و معشوق میں ہو گر شبِ وعدہ
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ

پئے سیرِ چمن جب گھر سے نکلے ساتھ غیروں کے
کھڑے دیکھا کیے اس شوخ کو ہم چشمِ حیرت سے

تڑپ رہا ہوں الٰہی میں دردِ فرقت سے
شبِ فراق کی آخر کہیں سحر بھی ہے

ادا میں، ناز میں، انداز میں، شوخی میں، غمزہ میں
نہ تیرا کوئی ہم سر ہے، نہ میرا کوئی ثانی ہے

غیرتِ بلقیس کی تسخیر کو حافظ ضرور
کھینچنا ہے نقشِ سلیمانی مجھے

اسحٰق : ـــــــ محمد اسحٰق

مشہور تاجر حاجی سیٹھ عبدالکریم (ف ۱۹۲۴ء) کا شمار کامٹی کے مخیر رئیسوں میں ہوتا تھا۔ ان کے دو بیٹے تھے : محمد صدیق اور محمد اسحٰق ۔ حسنِ اتفاق سے ان دونوں کو شاعری سے دلچسپی تھی اور اُن کے نام ہی اُن کے تخلص تھے ۔

صدیق صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے ۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے حلقۂ ارادت میں شامل تھے ۔ ان کا انتقال ۱۹۰۸ء میں عنفوانِ شباب میں ہوا ۔ ایک نعت کے چند شعر دیکھیے[1] :

سرکارِ مصطفےٰ میں گنہ گار آئے ہیں ۔۔۔ سر پر لیے گنہ کا گراں بار آئے ہیں

در پر تمہارے تشنۂ دیدار ہو عطا ۔۔۔ ہم کو بھی جامِ شربتِ دیدار آئے ہیں

کس شوق سے چڑھانے کو تربت پہ شاہ کی

صدیق لے کے پھولوں کا ہم ہار آئے ہیں

اسحٰق ۱۸۸۰ء میں پیدا ہوئے ۔ اردو فارسی حافظ محمد شکراللہ سے سیکھ کر ان میں پوری مہارت حاصل کی ۔ وہ بیڑی اور چمڑے کے ایک کامیاب تاجر تھے ۔ خدا نے اُنھیں خوب دولت عطا کی تھی ۔ اچھی خاصی جایداد کے بھی مالک تھے ۔ غرض کامٹی کے رئیسوں میں تھے ۔ انھوں نے ۱۹۶۱ء میں وفات پائی اور مسلم قبرستان کامٹی میں سپردِ خاک ہوئے ۔

ان کی شخصیت مختلف خوبیوں سے مالامال تھی ۔ وہ مذہبی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا کرتے ۔ اچھے شاعر تھے اور شاعر نواز بھی ۔ پھر اُن کی انسان دوستی، رحمدلی، دریادلی اور سخاوت اپنی مثال آپ تھی ۔ کامٹی کے نوجوانوں میں ذہنی و فکری بیداری پیدا کرنے کے لیے سعید نے محفلِ نقشِ سخن کے نام سے جو انجمن قائم کی تھی، اس کو اسحٰق نے نہ صرف بھرپور مالی تعاون دیا، بلکہ اپنا ایک مکان (پیلی حویلی) بھی اس کے

---

۱ ۔ سفینۂ نجات نومبر ۱۹۰۲ء ص : ۵

لیے وقف کر دیا ۔

انھوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں شاعری شروع کی ۔ مشورۂ سخن سعید سے کیا ۔ وہ اپنے استاد کی بے انتہا عزت کرتے اور ان کا حد درجہ خیال رکھتے تھے ۔ کوششوں کے باوجود بھی ان کی غزلوں کا کوئی نمونہ دستیاب نہیں ہوا ۔ البتہ یہ دو نعتیں ملی ہیں :

[۲] احمد مرسل کا میں جب سے ثنا خواں ہو گیا — خلق میں مشہور میرا نام ذی شاں ہو گیا
کفر سے شر سے بچایا دی عذابوں سے نجات — یا نبی ہم پر بڑا یہ فضل و احساں ہو گیا
جب بہار روضۂ اقدس نظر آئی مجھے — بار ور میرا نہال یاس و ارماں ہو گیا

وہ بھی دن ہو خواب میں آ کر مجھے فرمائیں آپ
اب تو پورا تیرا، اے اسحٰق ارماں ہو گیا

[۳] خدا کا وہ مقبول بندا نہیں ہے — جو فخر رسل کا شناسا نہیں ہے
بلا لو مدینے میں یا شاہ مجھ کو — مرا ہند میں دل بہلتا نہیں ہے
حمایت پہ میرے شفیع الوریٰ ہیں — مجھے روز محشر کا کھٹکا نہیں ہے
تو یکتا ہے، اے فخر عالم جہاں میں — کوئی تیرا واللہ ہمتا نہیں ہے

غلام پیمبر ہوں اسحٰق میں بھی
سکندر سے کم میرا رتبہ نہیں ہے

بیدل : ـــــ محمد بیکانو

بیدل، برق کے چھوٹے بھائی ہیں ۔ ۱۸۷۲ء میں پیدا ہوئے ۔ حافظ قاری محمد عبداللہ (ف : ۱۹۳۲ء) کی نگرانی میں قرآن مجید کا ناظرہ مکمل کیا ۔ چونکہ

---

۲ ۔ سفینۂ نجات جون ۱۹۰۲ء ص : ۲

۳ ۔ ایضاً جولائی ۱۹۰۲ء ص : ۱۶

ان کے بڑے بھائی ایک اچھے شاعر اور صاحب علم تھے لہٰذا اردو فارسی کی کچھ کتابیں انھی سے پڑھیں اور جب شاعری شروع کی تو ان سے مشورہ بھی کیا۔ بعد کو مولانا ناطق کو اپنا کلام دکھانے لگے۔ اُن کا انتقال ۱۹۶۲ء میں ہوا۔ انھوں نے ایک سادہ زندگی گزاری۔ وہ پابندِ شریعت، نیک سیرت اور حلیم الطبع ہونے کے علاوہ اچھے عامل اور میلاد خواں بھی تھے۔ کلام تباہ و تلف ہوگیا۔ محض چند مطبوعہ غزلیں محفوظ رہ گئی ہیں:

[1]ہمارے کام آجاؤ کسی دن تم تو ہم جانیں — کہ بیشک ٹھیک ہے دعوا تمھارا کارسازی کا

کبھی تو اس ہمارے حال پر بھی مہربانی ہو — بڑا شہرہ سُنا ہے آپ کی عاجز نوازی کا

اجل سے کون بچ سکتا ہے آکر دارِ فانی میں — نتیجہ ہے یہی عمرِ خضر کی بھی درازی کا

کیا بدنام اس نے پاکبازانِ محبت کو — رقیبِ روسیہ کو ہے جو دعوا پاکبازی کا

نہیں معلوم بیدلؔ، جن کو معنی لفظِ بیدل کے

خدا کی شان دعوا ہے انھیں جدت طرازی کا

[2]پیری میں لطف آ نہیں سکتا شباب کا — کیوں شیخ تجھ کو خبط ہوا ہے خضاب کا

مجھ تشنہ کام عشق کی حسرت نہ پوچھیے — اُس تیغِ آبدار سے طالب ہوں آب کا

سب کچھ روا ہے اس بتِ کافر کے عشق میں — دوزخ کا مجھ کو خوف نہ خطرہ عذاب کا

وہ مستِ ناز اور وہ بیدلؔ پہ لطفِ خاص

وہ دستِ نازنیں، وہ پیالہ شراب کا

[3]چار دن کے واسطے عہدِ شباب آیا تو کیا — حسنِ بے پایاں اگر مثلِ حباب آیا تو کیا

تم ہی پہلو میں نہیں تو ہیچ ہے بزمِ نشاط — کیف سے لبریز اگر جامِ شراب آیا تو کیا

کاش وہ آتے، بر آتیں دل کی ساری حسرتیں — میرے خط کا نامہ بر لے کر جواب آیا تو کیا

۱۔ جلوۂ یار، فروری مارچ ۱۹۱۶ء

۲۔ ایضاً اپریل ۱۹۱۶ء

۳۔ شاعر (آگرہ)، نومبر دسمبر ۱۹۳۳ء، ص: ۵۳

ہوش مجھ کو اے دلِ خانہ خراب آیا تو کیا
لوٹتا تھا بے خودی میں حسنِ جاناں کے مزے

جب مرے حامی ہیں بیدل شافعِ یوم النشور
فکر مجھ کو کچھ نہیں وقتِ حساب آیا تو کیا

فیض : ــــــــــ محمد فیض اللہ

ان کی پیدائش ۱۸۸۰ء میں کامٹی میں ہوئی۔ اردو، فارسی کا علم حافظ محمد شکر اللہ سے حاصل کیا اور شعر پر سعید سے اصلاح لی۔ سماجی اور سیاسی معاملات میں پُرجوش حصہ لینے کی وجہ سے چار مرتبہ (۱۹۳۱ء تا ۱۹۵۲ء) کامٹی میونسپل کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے اور پانچ سال (۱۹۴۲ء تا ۱۹۴۶ء) اسی کمیٹی کے نائب صدر رہے۔ وہ آل انڈیا مسلم لیگ، شاخ کامٹی کے بھی دس سال صدر رہے۔ فرینڈس کنزیومرس کوآپریٹیو اسٹورس (کامٹی) کے بانیوں میں تھے۔ ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۶ء تک اس ادارے کے صدر رہے۔ ۱۹۳۷ء میں مسلم قبرستان (کامٹی) کے صدر منتخب کیے گئے۔ اس عہدے پر ۱۹۵۴ء تک فائز رہے۔ کامٹی میں جدید علوم کی ترویج و اشاعت میں انھوں نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔ مدرسۃ المسلمین کامٹی (ربانی جونیر کالج) کی ترقی میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ وہ زندگی بھر اُس کے ٹرسٹی رہے۔

مطالعے کا بے حد شوق تھا۔ مالی حالت اطمینان بخش تھی لہٰذا کتابیں خرید کر پڑھنے کے عادی تھے۔ اس طرح ان کے پاس کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہوگیا تھا۔

۱۰ جون ۱۹۵۴ء کو رحلت فرمائی۔ مسلم قبرستان کامٹی میں مدفون ہیں۔ انیس آغائی نے تاریخِ وفات نظم کی ہے :

منشی فیض اللہ کی تاریخ یوں کہہ دو انیس
"ہائے وائے رہنمائے قوم رحلت کر گئے" ۱۳۷۳ھ

انتقال کے وقت ان کے دو بیٹے تھے۔ یونس فیضی (ف ۱۹۷۵ء) اور انیس فیضی۔ آل انڈیا کمیونسٹ پارٹی کے سرگرم کارکن، ور اردو کے کامیاب

صحافی شمیم فیضی، یونس فیضی کے بیٹے ہیں جو آجکل دہلی میں مقیم ہیں اور ادارۂ حیات سے منسلک ہیں۔

فیض کی شاعری کی ابتدا نعت گوئی سے ہوئی۔ بعد کو کچھ غزلیں بھی کہیں۔ افسوس ان کا شعری سرمایہ محفوظ نہ رہ سکا۔ نعت کے چند شعر دیکھیے:

لکھ رہا ہوں وصف کوے سیدِ ابرار کا ۔۔۔ ہو رہا ہوں مستحق میں خلد کے گلزار کا

یاد جب آئی مجھے دشتِ مدینہ کی بہار ۔۔۔ پھر گیا آنکھوں میں نقشہ خلد کے گلزار کا

جبّہ سائی کب ترے در کی مجھے ہوگی نصیب ۔۔۔ مدّعا کب ہوگا پورا اس دلِ غم خوار کا

حشر میں ہم عاصیوں کی پھر نہ ہو کیوں کر نجات ۔۔۔ ہاتھ میں اپنے ہے دامن' احمدِ مختار کا

وصف دندانِ شہہِ ہر دو جہاں کے فیض سے
ہو گیا ہر شعر میں عالم' دُرِ شہوار کا

سراج : ـــــــــ سراج الدّین

رشتے میں عبدالستار فاروقی کے چچا تھے۔ آبائی وطن مئو (ضلع اعظم گڑھ) ہے۔ کامٹی کے علمی، ادبی اور تعلیمی حلقے کی مشہور و معروف شخصیت تھے۔ ان کے والد محمد سلیم محکمۂ ڈاک میں پوسٹ مین تھے۔

سراج اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ابتدائی تعلیم ذاتی طور پر گھر کے بزرگوں سے پائی۔ اردو اسکول' کامٹی سے پرائمری کا امتحان پاس کیا بعد کو اسی اسکول میں مدرّس ہو گئے۔ اگرچہ صحت بہت اچھی تھی، لیکن کثرتِ کار کے باعث تپ دق کا عارضہ ہو گیا تھا، جو اُن کی موت کا سبب بنا۔ جوانی کے عالم میں جبکہ ان کی عمر صرف ۴۰ سال تھی اللہ کو پیارے ہو گئے۔

محمد رستم احقر نے تاریخ وفات کہی:

۱۔ سفینۂ نجات ستمبر ۱۹۰۲ء؛ ص: ۳

ہو گئی رحلت سراج الدین کی | ہو گئے رخصت سراج نامور
اب نہ پیدا ہوں گے ایسے باکمال | کم ہے ان کا کیجیے ماتم جس قدر

کہہ دیا احقر نے سالِ عیسوی
باغِ ہستی سے گیا عالی گہر ۱۹۲۱ء

اولاد میں ایک بیٹا عبدالغفار اور ایک بیٹی سائرہ بیگم اپنی یادگار چھوڑی تھی۔ عبدالغفار اب اس دنیا میں نہیں رہے، البتہ بیٹی حیات ہے اور کامٹی میں خوش و خرم زندگی گزار رہی ہے۔

ان کے دل میں قومی اور سماجی خدمت کا بے انتہا جذبہ تھا اس لیے ہمیشہ اسی کام میں مصروف رہا کرتے۔ کامٹی میں جدید تعلیم کو عام کرنے میں ان کا سب سے زیادہ حصہ ہے۔ انھوں نے اس سلسلے میں جو کوششیں کی ہیں، وہ قابلِ تحسین ہیں۔ سعید کے شاگرد تھے۔ ان کی شاعری کا آغاز انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ہوا۔ حالانکہ کوئی مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے، لیکن ان کی کئی غزلیں جلوۂ یار میں چھپ چکی ہیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے:

خامہ تڑپ کے ہاتھ سے اپنے نکل گیا | لکھا جو ماجرا دلِ خانہ خراب کا
برپا کہیں ہو نوح کا طوفاں نہ اے سراج | دریا ہے جوش پر مری چشمِ پُر آب کا

اٹھی جدھر نگاہ، بندھا جس طرف خیال
پایا تجھی کو، آیا نظر، تو ہی تو مجھے

دیکھا جدھر کو خلق میں دیوانہ کر دیا | آنکھوں میں کس غضب کا ہے جادو بھرا ہوا
جاتا ہے لے کے کوچۂ سفاک میں مجھے | بیٹھے بٹھائے دل کو خدا جانے کیا ہوا

۱۔ جلوۂ یار جولائی ۱۹۲۱ء، ص: ۳۴
۲۔ ایضاً اپریل ۱۹۱۶ء ص: ۱۱
۳۔ ایضاً مئی ۱۹۱۴ء ص: ۲۳
۴۔ ایضاً مارچ ۱۹۱۸ء ص: ۱۶

مُردے جی اُٹھے ہوا حشر بپا عالم میں
کس کی پازیب کی کانوں میں یہ آئی آواز[۵]

رہ جاتا ہے سینے میں تڑپ کر دلِ بسمل   آجاتی ہے جس دم نگہِ ہوش ربا یاد[۶]
رونا تو اسی کا ہے ہمیں باغِ جہاں میں   اک دن بھی نہ بھولے سے سراج اس نے کیا یاد[۷]

پھر بہار آئی ترقی پہ ہوا جوشِ جنوں
پھر چلی وحشتِ دل جانبِ صحرا لے کر[۸]

تم شوق سے تیرِ نگہِ ناز چلاؤ[۹]   بیٹھے ہیں ہم اپنا دلِ بیتاب سنبھالے
پڑتی ہے نظر بزم میں دونوں پہ برابر   دل کو کوئی تھامے کہ جگر اپنا سنبھالے

لڑ گئی کس ساقیِ مہوش سے آنکھ ایسی سراج
ہر گھڑی، ہر دم نظر آتے ہو جو سرشار سے

غیر دکھلاتے نہ اس طرح بدل کر آنکھیں[۱۰]   آپ کی مجھ پہ اگر چشمِ عنایت ہوتی

ایک نظم "ہماری جہالت" بھی ان کی یادگار ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں[۱۱]:

ہائے کیوں علم و ہنر سے ہم کو نفرت ہو گئی   کس لیے مسکن گزیں دل میں جہالت ہو گئی
کوئی اتنا بھی نہیں اب پوچھتا تم کون ہو   دو ہی دن میں کیا سے کیا ہم سب کی حالت ہو گئی
دیکھیے جس کو شکایت کر رہا ہے بخت کی   آہ کیسی قوم کی برگشتہ قسمت ہو گئی
بیشتر مشہور تھے علم و ہنر میں جس قدر   جہل و نادانی میں اس سے بڑھ کے شہرت ہو گئی

۵۔ ایضاً اگست ۱۹۱۴ء، ص: ۸
۶۔ ایضاً اپریل ۱۹۱۴ء، ص: ۱۳
۷۔ ایضاً فروری/مارچ ۱۹۱۶ء، ص: ۲۵
۸۔ ایضاً اپریل ۱۹۱۵ء، ص: ۱۱
۹۔ ایضاً جون ۱۹۱۵ء، ص: ۱۰
۱۰۔ ایضاً نومبر/دسمبر ۱۹۱۵ء، ص: ۸
۱۱۔ ایضاً اگست ستمبر ۱۹۱۶ء

کل تلک تو تھا نہایت شوق ہم کو علم کا | آج بے علمی پہ کیوں مائل طبیعت ہو گئی
کیا مٹا سکتے نہیں ہم داغِ بدنامی کو پھر | کیا حمیت علم کی بھی ہم سے رخصت ہو گئی

کیوں گنے جاتے ہیں ہم بے علم، مفلس جابجا
کس لیے ہر بزم میں نابود عزت ہو گئی

جوہر : ——— محمد عبدالرحیم

ان کا خاندان مئو (ضلع اعظم گڑھ) کا رہنے والا تھا۔ والد کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ انھوں نے اپنے چچا حافظ محمد اسحٰق (ف۔ فروری ۱۹۲۰ء) اور حافظ قاری عبداللہ سے اردو فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ انھی سے قرآن مجید بھی پڑھا۔ جولائی ۱۹۲۰ء میں جب اُن کی عمر بمشکل ۳۵ سال تھی دق کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہو گئے۔ ان کی شادی ناگپور میں حاجی نور محمد کی بیٹی کلثوم بی (ف ۱۹۳۹ء) سے ہوئی تھی۔ جسمانی یادگار میں ایک لڑکا وکیل احمد جوہر اور ایک لڑکی ہے۔

شاعری میں حافظ محمد عبداللہ حافظ کے شاگرد تھے۔ نعت گوئی سے خصوصی دلچسپی تھی۔ چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے :

وہ بیٹھ گئے وصل میں کیوں روٹھ کے مجھ سے[1]
اُن سے تو کبھی کی کوئی تکرار نہیں ہے

لڑ گئی آنکھ اک بتِ گلفام سے[2] | ہاتھ دھو بیٹھے دلِ ناکام سے
اس بتِ غارت گرِ دیں نے مجھے | دور رکھا حلقۂ اسلام سے
کھل گئی کیفیتِ وحدت تمام | مست آنکھیں ہو گئیں اک جام سے

۱۔ جلوۂ یار جون ۱۹۰۱ء ص : ۱۳
۲۔ ایضاً فروری ۱۹۱۲ء ص : ۸

میں ہوں کشتۂ ابروئے خمدار کا　　قتل اے قاتل نہ کر صمصام سے

کیا کہیں جوہر کسی سے حالِ دل

پس گئے ہم گردشِ ایام سے

آغا : ـــــــ عبدالمجید

نسلاً انصاری تھے ۔ ان کے والد محمد اسمٰعیل مئو (ضلع اعظم گڑھ) سے نقلِ مکان کر کے کامٹی میں بس گئے تھے ۔ انھوں نے ایک پُر وقار زندگی گزار کر ۱۹۰۲ء میں اس دنیا سے رختِ سفر باندھا ۔ ان کے تین بیٹے حاجی عبدالجبار (ف ۱۹۱۶ء)، عبدالواحد (ف ۱۹۰۱ء)، عبدالمجید آغا (ف ۱۹۵۲ء) اور چار بیٹیاں تھیں ۔ آغا ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے ۔ اردو فارسی کی تعلیم حافظ محمد شکر اللہ سے حاصل کی ۔ انھوں نے ہمیشہ ایک خوش حال زندگی گزاری ۔ وہ اعلا پیمانے پر خام چمڑوں کی تجارت کرتے تھے ۔

بروز جمعرات، ۱۱ اپریل ۱۹۵۲ء کو بعد مغرب انتقال کیا ۔ دوسرے دن نمازِ جمعہ سے پہلے مسلم قبرستان، کامٹی میں سُپردِ خاک ہوئے ۔ وفات کی تاریخ بسترِ علالت پر خود کہی تھی، جو انتقال کے بعد، الفاروق، کامٹی (۱۳ مئی ۱۹۵۲ء) میں ایڈیٹر کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہے :

خود ہی کہہ کر اپنی تاریخِ وفات

"آج رحلت کر گئے آغا مجید" ۔ ۱۹۵۲ء

محمد ابراہیم خلیل کے قطعۂ تاریخ سے بھی سن عیسوی برآمد ہوتا ہے :

تھا میسّر آپ کو تاریخ گوئی کا کمال

آپ تھے مانے ہوئے شاگردِ استادِ سعید

مصرعِ تاریخِ رحلت اسطرح کہہ دو خلیل

"وائے عالم سے گئے تاریخ گو منشی مجید" ۱۹۵۲ء

ہجری تاریخ شاطر حکیمی کے اس قطعے سے نکلتی ہے :

تاب جاتی رہی مجالس کی | تھے وہ سی پی کے بے بہا موتی
کاش آغا مجید کے بدلے | موت کو موت آگئی ہوتی ۱۳۷۱ھ

ان کی شادی کامٹی کے ایک بزرگ سالار بخت کی صاحبزادی رابعہ بی سے ہوئی تھی۔ اس خاتون کا ۱۹ جولائی ۱۹۷۷ء کو انتقال ہوا۔ ان کے تین بیٹے (محمد فضل الرحمٰن آغائی، انیس الدین (انیس آغائی) اور مقبول احمد آغائی) اور ایک بیٹی ہوئی۔ ان میں محمد فضل الرحمٰن آغائی ۲۸ نومبر ۱۹۵۸ء کو جاں بحق ہو گئے۔

ان کی شاعری کی ابتدا غزل گوئی سے ہوئی۔ وہ سعید کے ارشد تلامذہ میں تھے، اسی لیے شعر گوئی کے فن سے اچھی طرح واقف ہو گئے تھے۔ پہلے مجید پھر آغا تخلص اختیار کیا۔ تاریخ گوئی میں باکمال تھے۔ اس میں ان کو کافی شہرت ملی۔ ہزلیہ شاعری میں بھی ایک منفرد مقام رکھتے تھے۔ افسوس! ان کا شعری سرمایہ ضائع ہو گیا۔ بس وہی موجود ہے، جو جلوۂ یار اور الفاروق میں شائع ہوا ہے۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

[1] وہ مدہوشی کا عالم ہو قیامت تک نہ ہوش آئے | پلا ایسی مرے ساقی دعائے خیر کرتا ہوں
فراقِ روئے روشن میں جو گھبراتا ہے دل میرا | فلک پر جلوۂ خورشید رخشاں دیکھ لیتا ہوں

نکلنا اے مجید ارمانِ دل کا سخت مشکل ہے
وہ نفرت مجھ سے کرتا ہے میں حسرت جس کی رکھتا ہوں

[2] ارماں ہے نکلنا مرا مشکل مرے ہاتھوں | تم چاہو تو آسان ہے دشوار نہیں ہے
ہے جب سے مجید اک بتِ پرفن سے محبت | قابو میں مرے میرا دلِ زار نہیں ہے

[3] بادہ نوشوں کی نکل جاتی ہے جان | مے جو گر جاتی ہے ساقی جام سے

۱۔ جلوۂ یار دسمبر ۱۹۱۰ء، ص: ۲۲
۲۔ ایضاً جولائی اگست ۱۹۱۰ء ص: ۱۱
۳۔ ایضاً فروری ۱۹۱۲ء ص: ۱۵

ہو گیا مہمان وہ خورشید رُو | دن نکل آیا مرے گھر شام سے
بُتوں کو دے کے دل اپنا، یہ دیکھتے ہیں ہم
عوض میں کچھ ہمیں ملتا ہے یا نہیں ملتا

۵
آتے ہی جوانی انھیں کیا کیا نہ ہوا یاد | اندازِ ستم یاد ہوا، طرزِ جفا یاد
دشمن کو بھی اللہ نہ دے داغِ جدائی | وہ صدمے اٹھائے ہیں کہ آتا ہے خدا یاد
میں کون تھا، جو مجھ کو طلب بزم میں کرتے | غیروں سے تھی الفت انھیں، غیروں کو کیا یاد
مقتل میں جو دیکھا انھیں کھینچے ہوئے خنجر | مشتاقِ شہادت کو مجید آئی قضا یاد
کس طرح بچائے کوئی جان و جگر و دل
انداز ترے شوخ، ترے ناز و ادا شوخ

خلیل : ــــــــ محمد ابراہیم

آبائی وطن مئو (ضلع اعظم گڑھ) اور جوکھو والد کا نام ہے۔
۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ حافظ محمد شکر اللہ سے اردو فارسی پڑھی۔ کامٹی کے شاعرانہ ماحول سے متاثر ہو کر شعر کہنا شروع کیا۔ مختلف اوقات میں برق، اخگر اور مولانا ناطق سے اصلاح لی۔ ابتدا میں تخلص حرّاق تھا لیکن بعد کو خلیل اختیار کر لیا۔
ملنسار اور پابندِ وضع تھے۔ تجارت کے سلسلے میں کچھ عرصے رنگون (برما) میں مقیم رہے۔ کامٹی میں ان کے معاش کا ذریعہ سوڈا فیکٹری تھی۔ بعد کو اسے بند کر کے بنکری کا کام شروع کر دیا تھا۔ مارچ ۱۹۵۲ء میں رحلت فرمائی۔ تاریخِ وفات انیس آغائی نے کہی :

۴۔ جلوۂ یار اگست ۱۹۱۲ء ص : ۲۱
۵۔ ایضاً اپریل ۱۹۱۴ء ص : ۲۳
۶۔ ایضاً جنوری ۱۹۱۳ء ص : ۲۳

نگاہیں ڈھونڈتی پھرتی ہیں خلق میں ہر سُو
مگر کہاں مجھے حاصل ہے دید یہ ر قا. نُو
وفات حضرتِ منشی خلیل کی، اے انیس
رُلا کے مجھ کو رہی والے خون کے آنسو
۱۳۷۲ھ

اولاد میں ایک بیٹا مظہر الحق اور دو بیٹیاں ہیں۔

جلوۂ یار میں جو غزلیں ملی ہیں، ان کے چند شعر حاضر ہیں:

لگا دے گا کسی دن آگ یہ عشقِ حقیقی کی
دبے گا تا بکے دل میں شررِ عشقِ مجازی کا

دل آزاری بھی اس کی باعثِ تسکینِ خاطر ہے
ہمیں منظور ہے یہ بھی طریقہ دلنوازی کا

مجھے فیضِ سخن ملتا ہے ناطق سے خلیل اب تو
نہ ہو انداز دلکش کیوں مری مضموں طرازی کا

ہمدم وہ اب کہاں ہیں جوانی کے ولولے
پیری میں لطف آ نہیں سکتا شباب کا

نتیجہ دیکھیے آخر میں کیا نکلتا ہے
ہم اپنا دل اسے بے آزمائے دیتے ہیں

اُس حسن کے بازار میں اے یوسفِ ثانی
وہ کون ہے جو تیرا خریدار نہیں ہے

پہلو میں تھا ابھی، ابھی پہلو سے دور ہے
فرقت کی شب یہ حالِ دلِ ناصبور ہے

ساقی کی چشمِ مست کا اللہ رے اثر
واللہ بے پیے ہوئے مجھ کو سرور ہے

سنتے ہیں اب زمیں پہ وہ رکھتے نہیں قدم
حسنِ شباب پر انھیں اتنا غرور ہے

۱۔ جلوۂ یار، فروری مارچ ۱۹۱۶ء، ص: ۱۳
۲۔ ایضاً اپریل ۱۹۱۶ء، ص: ۲۰
۳۔ ایضاً جنوری ۱۹۱۱ء، ص: ۱۲
۴۔ ایضاً جولائی اگست ۱۹۱۰ء، ص: ۸
۵۔ ایضاً فروری ۱۹۱۹ء، ص: ۲۳

تیرے سوا نظر نہیں آتا کوئی مجھے
ہر جزو کل میں تو ہی ہے، تیرا ہی نور ہے

تارے، نہ چاند اور نہ سورج، خدا، خلیل
اپنا خدا تو وہم و گماں سے بھی دور ہے

حنیف : ـــــــ محمد حنیف

اُن کے دادا محمد عظیم اللہ، اعظم گڑھ سے کامٹی آئے۔ وہ مومن برادری کے سردار تھے۔ حنیف کے والد کا نام محمد اسمٰعیل تھا۔ وہ بھی سرداری کے منصب پر فائز تھے۔ محمد اسمعیل کے دو بیٹے تھے : محمد حنیف اور حاجی محمد (ف ۱۹۷۹ء)
حنیف مذہبی انسان تھے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ امامت میں گزرا۔ اس سلسلے میں وہ کسی ایک مسجد میں مستقل نہیں رہے بلکہ متعدد مساجد میں خدمات انجام دیں۔ شاعری کی ابتدا میں اخگر لیکن بعد کو شوق مالیگانوی سے اصلاح لی۔ ۷۵ سال کی عمر میں ۱۹۶۹ء میں انتقال کیا۔ دو بیٹے وکیل احمد (ف ۱۹۷۵ء)، محمد خورشید اور دو بیٹیاں ہوئیں۔ نمونۂ کلام یہ ہے :

حالت کو مری دیکھ کے اب کہتے ہیں وہ بھی
مجنوں کی طرح یہ بھی ہے دیوانہ کسی کا

ہنستا بھی ہے روتا بھی ہے غمگیں بھی ہے خوش بھی
کیا جانیے کس دھن میں ہے دیوانہ کسی کا

خبر ملی ہے کہیں تم کو مرگِ دشمن کی
بتاؤ آج پریشان حال ہو کیوں کر

یہی تو مونس و ہمدم رہا شبِ فرقت
جدا پھر آپ کا دل سے خیال ہو کیوں کر

غزل تو آپ نے لکھی ہے ایسی ست حنیف
پسند خاطرِ اہلِ کمال ہو کیوں کر

۱۔ جلوۂ یار اکتوبر ۱۹۱۸ء، ص : ۱۰

۲۔ ایضاً جون جولائی ۱۹۱۲ء، ص : ۸

ناظم : ____ فقیر محمدؒ

یو۔ پی کے ضلع فیض آباد میں ٹانڈہ نام کی ایک تحصیل ہے۔ یہی تحصیل ان کا آبائی وطن ہے، جہاں سے اُن کے والد منشی امان اللہ ہجرت کرکے کامٹی میں آبسے۔ یہیں ۱۸۹۰ء میں ناظم پیدا ہوئے۔ انھوں نے اس وقت کے رواج کے مطابق اردو، فارسی اور عربی کی تعلیم کامٹی کے ایک بزرگ حافظ صفی اللہ میاں جی (ف ۱۹۲۶ء) سے حاصل کی اور ان زبانوں میں اچھی خاصی مہارت حاصل کرکے اپنے گھر میں ایک مکتب کھول لیا۔

وہ بلاشبہ عربی فارسی کے نہ صرف ایک اچھے عالم تھے بلکہ ایک طویل عرصے تک کامٹی میں اُن کی ذات مشرقی علوم کی تحصیل کا واحد سرچشمہ رہی ہے۔

انھیں مذہب سے گہرا لگاؤ تھا۔ حضرت شاہ غلام محمدؒ کے مرید اور ایک کامیاب عامل تھے۔ سلسلۂ طریقت کامٹی کے مشہور بزرگ حضرت عبداللہ شاہؒ (ف ۲۵ جنوری ۱۸۷۸ء مطابق ۲۱ محرم الحرام ۱۲۹۵ھ) سے ملتا ہے۔

سادگی پسند اور محنت کے عادی تھے۔ آبائی پیشہ پارچہ بافی ان کا مستقل ذریعۂ معاش تھا۔ یہ کام کافی محنت طلب تھا، اس لیے صحت بالعموم ہمیشہ اچھی رہی۔ کوئی جسمانی عارضہ لاحق نہیں تھا۔ بس کبرسنی کی وجہ سے کمزوری بڑھتی جارہی تھی۔ اسی میں ۱۳ جون ۱۹۷۲ء کو رہگرائے عالم جاودانی ہوئے۔ مسلم قبرستان، کامٹی میں آسودۂ خواب ہیں۔

انیس آغائی نے وفات کی تاریخ کہی :

خوش بیاں شاعر تھے، خوش تحریر بھی — دہرِ فانی سے گئے باغِ ارم

سالِ رحلت کہہ دو منقوطی انیس — دل کو بے حد ہوگیا ناظم کا غم ۱۹۷۲ء

صلبی اولاد میں چار لڑکے (جمال احمد، جلیل احمد، کمال احمد، عقیل احمد) اور تین لڑکیاں زندہ ہیں۔

آغازِ شعر گوئی میں بیدل کامٹوی سے اصلاح لی۔ بعد کو سیماب اکبرآبادی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے۔ ان کا کلام ماہنامہ شاعر آگرہ میں کثیر تعداد میں چھپا ہے۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں :

[1] اپنی ہستی کو خودی سے پہلے تو بیگانہ کر — پھر رہِ الفت میں طوفِ کعبہ و بتخانہ کر

رکھ قدم اس جا جہاں وحشی کوئی پہنچا نہ ہو — ہے جنوں تیرا نیا، پیدا نیا ویرانہ کر

ہے تقاضا وقت کا یہ وقتِ مے نوشی نہیں — اپنے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے شیشہ و پیمانہ کر

جس کی مست آنکھوں سے ہے ناظم نظامِ کائنات
اُس کے ہر نقشِ قدم پر سجدہ مستانہ کر

[2] اللہ رے میری شبِ تنہائی کا عالم — اک شمع ہے باقی کوئی دمساز نہیں ہے

ہر سانس کے پردے میں تو خود بول رہا ہے — یہ سرمد و منصور کی آواز نہیں ہے

کہتا ہوں زباں سے جو میں الفاظ ہیں تیرے — یہ تیری صدا ہے، مری آواز نہیں ہے

عشقِ بتِ طناز میں حالِ دلِ مضطر
کس سے کہوں ناظم کوئی ہمراز نہیں ہے

[3] ہو گیا زیر و زبر سارا نظامِ کائنات — آہِ دل کیسا تھا جب طوفانِ چشمِ تر اٹھا

ہوش کی حالت میں ہوتا ہے کہیں عرفانِ غم — پہلے دیوانہ تو بن، کوہِ الم سر پر اٹھا

[4] بتائیں کیوں نہ مونس ہجر کی شب درد کو غم کو — انھیں دونوں سے ملتا ہے تڑپنے کا مزا ہم کو

[5] جنونِ عشق کی تکمیل ہونے والی ہے — ملی ہیں قیس کے دامن کی دھجیاں مجھ کو

[6] اقرار اُن کا باعثِ تسکینِ قلب ہے
رہتا ہے اعتبار شبِ انتظار ساتھ

---

۱. شاعر (آگرہ) جولائی ۱۹۳۸ء ص: ۳۲
۲. ایضاً جولائی ۱۹۳۷ء ص: ۵۵
۳. ایضاً نومبر ۱۹۳۷ء ص: ۲۲
۴. ایضاً نومبر دسمبر ۱۹۳۲ء ص: ۵۲
۵. ایضاً نومبر دسمبر ۱۹۳۳ء
۶. درِ سخن کامٹی مارچ ۱۹۳۵ء ص: ۱۱

شکوۂ ماضی تھے جتنے دور دل سے ہو گئے
دیکھ کر اس بُت کی صورت مجھ کو پیار آہی گیا

میں اے ناظم کسی کے آستاں تک کس طرح پہنچوں
کہ اکثر روک دیتی ہے نگاہِ پاسباں مجھ کو

سلسلہ سوز کا ہے ساز سے قائم ہمدم[۹]
نغمۂ سوز ہے جو ساز کی آواز میں ہے

ہجر میں مونس ہے میرا دردِ دل[۱۰]
جی بہلتا ہے اسی غمخوار سے

اے حسنِ دوست زیست ہے مشکل ترے بغیر[۱۱]
جینے کا لطف کچھ نہیں حاصل ترے بغیر

دیوانگی کا میری تماشائی تو نہیں ہے
بے لطف ہیں یہ طوق و سلاسل ترے بغیر

ہو الگ کعبۂ مقصود جہاں سے اپنا[۱۲]
ہم نشیں سلسلہ ایسا کوئی ایجاد کریں

وہ آج آئینگے امید کیا کریں ناظم[۱۳]
کہ کامیاب کبھی انتظار ہو نہ سکا

زمانہ لے رہا ہے کروٹیں ہشیار ہو جاؤ[۱۴]
تم اپنی سعی پیہم سے کرو بیداریاں پیدا

حسرتیں پھر میرے دل میں چٹکیاں لینے لگیں[۱۵]
پھر کسی کی یاد شاید دلنشیں ہونے کو ہے

پھر شوقِ خضرِ راہ بنا شوقِ دوست میں[۱۶]
پھر میں ہوں اور سلسلۂ جستجوئے دوست

شبِ غم بھی قیامت کا نمونہ بن کے آئی تھی
رہا شب بھر بلا کا سامنا اوّل سے آخر تک[۱۷]

۷۔ شاعر (آگرہ) جولائی ۱۹۳۳ء
۸۔ ایضاً نومبر دسمبر ۱۹۳۴ء
۹۔ ایضاً مارچ ۱۹۳۶ء
۱۰۔ ایضاً جولائی اگست ۱۹۳۴ء
۱۱۔ ایضاً ستمبر ۱۹۳۶ء
۱۲۔ ایضاً جون ۱۹۳۸ء
۱۳۔ ایضاً اگست ۱۹۳۸ء
۱۴۔ ایضاً اکتوبر ۱۹۳۷ء
۱۵۔ ایضاً اکتوبر ۱۹۳۴ء
۱۶۔ ایضاً فروری ۱۹۳۸ء
۱۷۔ ایضاً مئی ۱۹۳۶ء

شہرت : ــــــــ محمد ابوبکر

ان کے دادا پہاڑن مئو (ضلع اعظم گڑھ) سے کامٹی آئے تھے ۔ والد کا نام عبدالمجید تھا۔ وہ عطر فروشی کا کاروبار کرتے تھے ۔ انھیں بھی شعر و شاعری سے دلچسپی تھی۔ ۱۹۱۰ء میں رحلت فرمائی ۔ ان کے تین بیٹے تھے : محمد ابوبکر (شہرت)، عبدالستار اور محمد ۔ یہ تینوں بھائی اب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں ۔ پارچہ بافی ان کا ذریعۂ معاش تھی ۔

شہرت ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوئے ۔ اردو فارسی کی علاوہ دین کی تعلیم بھی حافظ مولا بخش (ف ۱۹۰۴ء) اور حافظ عبدالرحیم (ف ۱۹۱۵ء) سے حاصل کی۔ اُن کا انتقال ۱۰ مارچ ۱۹۷۷ء کو ہوا۔ وفات کی تاریخ انیس آغائی نے کہی ہے:

منشی بوبکر، نیک، خوش طینت — دہر فانی سے ہو گئے رخصت
چلتے پھرتے ہوئی اچانک موت — دل کی دل ہی میں رہ گئی حسرت
قبلہ ناطق کے آپ تھے شاگرد — اس لیے اُن سے خاص تھی قربت

کہدو تاریخ انیس آغائی
"آج ہائے ہوا غم شہرت"
۱۹۷۷ء

شادی دھامن گاؤں میں سائرہ بی (ف ۱۹۷۸ء) کے ساتھ ہوئی تھی ۔ فی الحال تین لڑکے (ظہیر الاسلام، بشیر الجمال، محمد خورشید الحق) اور دو لڑکیاں زندہ ہیں۔ وہ نیک صفت انسان تھے ۔ احکام شریعت کی سختی سے پابندی کرتے ۔ اچھے عامل تھے ۔ تصوف و سلوک سے گہرا لگاؤ تھا اور اس میں اپنے نانا کے مرید تھے۔ کتب بینی ان کا محبوب مشغلہ تھا ۔ انھوں نے کامٹی کی ہر علمی و ادبی تحریک میں عملی حصہ لیا اور سماجی اور قومی کاموں میں ہمیشہ آگے رہے ۔ چنانچہ مدرسہ سراج المومنین (کامٹی) کے مسلسل اکتیس سال (۱۹۵۲ء تا ۱۹۷۳ء) ناظمِ اعزازی رہے اور انتہائی خلوص و محنت سے یہ خدمت انجام دی ۔ وہ انجمن ضیاء الاسلام کامٹی

انجمن اصلاح الانصار کامٹی اور انوار الاسلام کامٹی کے بھی رکن تھے۔
ان کی شاعری کی ابتدا بیسویں صدی کے اوائل میں ہوئی۔ شروع میں تخلص گوہر تھا اور حافظ سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ لیکن مولانا ناطق کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہونے کے بعد شہرت تخلص اختیار کرلیا۔ وہ مولانا کے چہیتے شاگردوں میں تھے۔ اگرچہ کافی تعداد میں غزلیں کہی تھیں لیکن لاپرواہی کی وجہ سے بیشمار غزلیں ضائع ہوگئیں۔ بس چند غزلیں اُن کے ورثا کے پاس محفوظ رہ گئی ہیں۔ چند منتخب اشعار درج کیے جاتے ہیں:

اُس جفا جو کو اگر مجھ سے محبت ہوتی [1] ــــ سن کے کچھ غیر سے کیوں دل میں کدورت ہوتی
داورِ حشر سے شکوہ جو حف کا کرتا ــــ اور بھی ایک قیامت میں قیامت ہوتی

شہرت ہوئی تباہیِ الفت فسانہ خیز [2]
چرچا ہے جا بجا مرے حالِ خراب کا

رکھتی ہیں ہمیں مست وہ بدمست نگاہیں [3] ــــ گردش میں رہا کرتا ہے پیمانہ کسی کا
اُس جنبشِ لب نے مجھے مرنے سے بچایا ــــ کام آگیا اندازِ مسیحانہ کسی کا

ہے شہرتِ گمنام کی کچھ دن سے یہ شہرت
سب کہتے ہیں وہ شخص ہے دیوانہ کسی کا

رہا کرتے ہو کیوں تم خشمگیں اے دلربا ہم سے [4] ــــ بتاؤ تو بھی ایسی ہوئی ہے کیا خطا ہم سے
اگر وہ روٹھتے ہیں روٹھ جانے دو خدا حافظ ــــ نہ روٹھے حضرتِ گوہر مگر بختِ رسا ہم سے

چشمِ گریاں سے بچےگی نہ فلک کی کشتی [5]
میرا نالہ ہے یہ کچھ نوح کا طوفان نہیں

۱۔ جلوۂ یار، نومبر دسمبر ۱۹۱۵ء، ص : ۱۲
۲۔ بیاضِ شہرت (قلمی)
۳۔ جلوۂ یار، اکتوبر ۱۹۱۸ء ص: ۱۵
۴۔ ایضاً جنوری ۱۹۱۶ء ص: ۱۸
۵۔ بیاضِ شہرت (قلمی)

موت آئیگی ہمیں آپ کو رخصت کر کے
ہم اِدھر جائینگے اور آپ اُدھر جائینگے

اُن کے انداز پہ مرتا ہے زمانہ شہرتؔ
جائیگی ساری خدائی؎ وہ جدھر جائینگے

پڑے پتھر، خدا کے نیک بندوں سے یہ نفرت ہے
بتوں کو ناپسند آیا بالآخر دُور ہو جانا

غضب تھا حُسن کی تعریف میں حُسنِ بیاں میرا
ستم تھا سن کے اس سفاک کا مغرور ہو جانا

حیرتِ دید ہی سہی تیری طرف نظر تو ہے
اپنی خبر نہیں سہی، مجھ کو تری خبر تو ہے

ترکِ وفا نہیں سہی، عذرِ وفا تو ہے انھیں
صاف نہیں نہیں سہی، لب پہ اگر مگر تو ہے

حسرتوں نے مرے سینے میں کیا حشر بپا
جب کیا بڑھ کے اشارہ تری انگڑائی نے

ہے جفا کی بھی وفا کی طرح دل کو آرزو
جانتے ہیں خوب ہر اندازِ معشوقانہ ہم

احقرؔ : ـــــــ محمد رستم

اِن کا خاندان مئو (ضلع اعظم گڑھ) کا رہنے والا تھا، جہاں سے ان کے جدِ امجد محمد عباد اللہ، ۱۸۵۷ء کے بعد، کامٹی میں آبسے۔ محمد عباد اللہ درویشانہ صفات کے مالک تھے۔ انھوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں رحلت فرمائی۔ ان کے چار بیٹے تھے: ڈومن سیٹھ (ف ۱۹۰۴ء)، حاجی عبدالرحمٰن سردار (ف ۱۹۲۸ء) عبدالکریم (ف ۱۹۱۱ء) اور محمد یعقوب عرف منزل سیٹھ (ف ۱۹۲۰ء)۔
احقرؔ کے والد کا نام محمد یعقوب عرف منزل سیٹھ تھا، جو چمڑے کے ایک مشہور تاجر تھے۔

۶۔ جلوۂ یار، مارچ ۱۹۱۹ء، ص: ۷

۷۔ بیاضِ شہرتؔ (قلمی)

۸۔ ایضاً

۹۔ ایضاً

۱۰۔ ایضاً

ان کا شمار عمائدینِ شہر میں ہوتا تھا۔ وہ مومن برادری کے سردار تھے۔ بڑے علم دوست، اور مہمان نواز تھے۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے، محمد رستم (احقر) اور محمد قمر الدین۔ اِن دونوں نے اس علاقے میں خوب شہرت حاصل کی۔ "احقر علمی، سیاسی اور سماجی کاموں کی وجہ سے مشہور ہوئے اور قمر الدین نے فٹبال میں اپنا نام روشن کیا۔ وہ انوار الاسلام فٹبال کلب، کامٹی کے سرپرست اور کیپٹن تھے۔

احقر ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم سراسر نجی طور پر ہوئی۔ جب شعور کی منزل پر پہنچے تو سماجی اور سیاسی کاموں میں حصہ لینے لگے جس کے صلے میں کئی مرتبہ کامٹی میں میونسپل کمیٹی کے کونسلر منتخب ہوئے اور "فخرِ قوم" کے گرانقدر خطاب سے نوازے گئے۔ اُس زمانے میں کامٹی میں جتنے بھی ادبی اور شعری جلسے ہوتے، وہ اس کے سکتر مقرر کیے جاتے۔ بروز بدھ، ۳۰ اگست ۱۹۵۰ء (۱۵ ذیقعدہ ۱۳۶۹ھ) کو تقریباً ۱۲ بجے دن میں، یکایک دل کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال کیا۔ اُسی شام مُسلم قبرستان کامٹی میں تدفین عمل میں آئی۔ شاطر حکیمی نے قطعہ تاریخِ وفات کہا :

قوم کا غمگسار تھا نہ رہا	ایک خدمت گزار تھا نہ رہا
یادِ احقر رُلائے گی برسوں	شاعرِ خوش نگار تھا نہ رہا
موت کے آگے ایک چل نہ سکی	عاقل و ہوشیار تھا نہ رہا

مرگِ احقر سے خام ہیں سب کام
"آدمی پختہ کار تھا نہ رہا" ۱۹۵۰ء

پوری زندگی بے فکری اور آرام سے گزری۔ والد کے انتقال کے بعد چرم فروشی کا کاروبار ترکے میں ملا تھا، جس سے انھیں معقول آمدنی ہوجاتی تھی۔ خوش اخلاق، خوش مزاج اور خوش گفتار تھے۔ ہمیشہ فلاح و بہبودی کے کاموں میں مشغول رہتے۔ عمر کے آخری حصے میں صوم وصلوٰۃ کے پابند ہو گئے تھے۔

انھوں نے ۱۹۱۶ء میں شاعری شروع کی۔ کلام پر سعید سے اصلاح لی۔ ان کے بعد مولانا ناطق سے مشورہ رہا۔ ان کی غزلیں جلوۂ یار، خلافت، مدینہ، الفاروق اور شاع

میں شائع ہوئی ہیں ۔ اس صنف کے وہ ایک بہترین شاعر تھے ۔ تاریخ گوئی میں بھی ملکہ حاصل تھا ۔ کلام کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا، اس لیے اخبار و رسائل میں تلاش سے جو غزلیں ملی ہیں، انہی میں سے چند شعر نذر ہیں :

کرنا جو ہے وہ کرلے آج کل کا ہے انتظار کیا | آئے نہ آئے لوٹ کر سانس کا اعتبار کیا
ان کی شکایتیں فضول، ان کا ملال بے حصول | بس کا نہیں جب اپنا دل، غیر پہ اختیار کیا
غم بھی خوشی کے ساتھ اگر ہو تو ہے لطفِ زندگی | آکے بھلا کرے گی کیا، بعدِ خزاں بہار کیا
ہستی میں رازِ نیستی، روزِ ازل سے ہے نہاں | جس کی بِنا ہو بے ثبات، ہوگی وہ پائیدار کیا

کھنچ گئے آپ الفتِ دخترِ رز سے شکل مے
آج یہ سن رہے ہیں ہم احقرِ بادہ خوار کیا

[۲] یہ اگر نورِ تجلی سے فروزاں ہوتا | دل مرا ایک چراغِ تہِ داماں ہوتا
ہو کر آلودۂ دنیا، نہ پریشاں ہوتا | ہوتی انسانیت انساں میں تو انساں ہوتا
وہ نہ آتے نہ سہی کاش اجل ہی آتی | کوئی تو میرا شریکِ غمِ ہجراں ہوتا

قیس کے ساتھ گئی رونقِ صحرا احقر
زندہ ہوتا تو یہ اس طرح نہ ویراں ہوتا

[۳] پیامِ مرگ آتے ہی ملا اس دہر میں ہم کو | نہاں رکھا تھا حق پردہ ہائے عیش میں غم کو
دفورِ غم سے جب اس دل کی حالت غیر ہوتی ہے | نکل آتے ہیں آنسو آنکھ سے فریاد و ماتم کو
سب اپنی اپنی فطرت سے اگر مجبور ہیں یارب | تو بہتر ہے جلا دے برق میرے خرمنِ غم کو
سہی جاتی نہیں طعنہ زنی اب چارہ فرما کی | بہت پچھتا رہا ہے منہ لگا کر زخم مرہم کو

جو کرنا چاہتے ہو فتح میدانِ سخن احقر
نہ چھوڑو ہاتھ سے اپنے عنانِ سعیِ پیہم کو

---

۱ - الفاروق کامٹی ۲۰ مارچ ۱۹۵۰ء
۲ - درِ سخن کامٹی مارچ ۱۹۳۵ء، ص : ۱۱
۳ - شاعر آگرہ نومبر دسمبر ۱۹۳۳ء، ص : ۵۱

[4] جتا کر عشق پروانوں نے رُسوا کر دیا اس کو — اسی سے شمعِ محفل دل جلی معلوم ہوتی ہے
حیاتِ جاودانی ہے، فنا ہونا محبت میں — ہمیں تو موت ہی میں زندگی معلوم ہوتی ہے
کس لیے جوش پہ دریائے الم ہے اپنا — کون ہوتا ہے جُدا دیدۂ گریاں ہم سے
عالم جوشِ جنوں ہے دلِ پُرغم جو یہی — تو نہ چھوٹے گا کوئی دشت و بیاباں ہم سے

نغمہ سنجی کا کرے دعوا وہ پھر اے احقر
لے سبق پہلے ذرا بلبلِ بستاں ہم سے

اب قطعات ملاحظہ کیجیے :

[6] احقر کو جو رحمت پہ بھروسہ نہیں ہوتا — بے خوف گناہوں سے وہ آشنا نہیں ہوتا
سرمایۂ نیکی ہی نہیں حشر کا کیا غم — سنتے ہیں کہ نادار پہ دعوا نہیں ہوتا
جلوۂ دوست سے معمور ہے مسکن میرا — راستہ دیکھے نہ اب وادیِ ایمن میرا
زینتِ دیر و حرم شانِ کلیسا ہوں میں — مرتبہ جانتے ہیں شیخ و برہمن میرا

شاطر حکیمی کے مجموعۂ کلام "موت و حیات" کی اشاعت کے موقع پر جو تاریخی قطعہ کہا ہے، وہ ملاحظہ کیجیے :

مرحبا کیا کلامِ شاطر ہے
کام کا کام ہے اور بات کی بات
کیوں نہ مقبولِ دہر ہو احقر
اس میں پنہاں ہے رازِ موت و حیات

۱۳۶۲ھ

۴۔ الفاروق، ۲۲ مئی ۱۹۴۸، ص : ۳

۵۔ جلوۂ یار، اگست ۱۹۲۰، ص : ۱۲

۶۔ الفاروق، ۲۲ مئی ۱۹۴۸، ص : ۳

۷۔ طورِ درخشاں مرتبہ طرفہ قریشی (۱۹۴۷ء) ص : ۱۷۱

طالب: ــــــــ محمد طالب الدین

ان کے جدِ اعلا شیخ بڑے، مدراس کے رہنے والے تھے۔ شیخ بڑے کے ایک بیٹے تھے شیخ ٹیپو، جو فنِ سپہ گری کے ماہر تھے۔ یہی شیخ ٹیپو، طالب کے جدِ امجد تھے۔ والد کا نام شیخ عبدالرحیم تھا، جو سکندر لانسرز میں صوبے دار تھے۔ اسی سلسلے میں کامٹی آئے اور ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد یہیں سکونت اختیار کرلی۔ اچھے طبیب تھے، لہٰذا ریٹائر ہوتے ہی طبابت شروع کردی اور اس میں کافی شہرت حاصل کی۔ ۱۹۱۷ء میں بعمر پچھتر سال رحلت فرمائی۔ انھوں نے یکے بعد دیگرے تین شادیاں کیں۔ پہلی بیوی سے دو لڑکیاں اور دوسری سے دو لڑکے ہوئے۔ یہ دونوں بھی فوج میں ملازم تھے۔ آخری بیوی سے آٹھ اولادِ نرینہ ہوئیں: محمد نجم الدین، غلام دستگیر، محمد طالب الدین (طالب)، محمد بشیر الدین، محمد حفیظ الدین، محمد زین العابدین، محمد یسیر الدین اور محمد علیم الدین۔ محمد نجم الدین اور محمد بشیر الدین کا عین جوانی میں انتقال ہوگیا۔ محمد زین العابدین نے بچپن میں وفات پائی۔ غلام دستگیر کا انتقال ستر سال کی عمر میں ۲۵ مئی ۱۹۶۶ء کو ہوا۔ وہ ڈی اے جی پی ٹی ڈپارٹمنٹ، ناگپور میں ملازم تھے۔ محمد یسیر الدین تقسیم کے بعد پاکستان میں آباد ہوگئے، اور محمد علیم الدین ربانی جونیر کالج میں مدرس تھے۔ اب خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ انھوں نے کئی نصابی کتابیں مرتب کی ہیں، جو عرصے تک ناگپور ڈویژن کے ابتدائی اور ثانوی مدارس میں جاری رہیں۔ انڈین یونین مسلم لیگ، شاخ ناگپور کے جنرل سکریٹری شمیم صادق انھی کے بیٹے ہیں۔

محمد حفیظ الدین ادبی و علمی اعتبار سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ وہ ۱۹۰۱ء میں کامٹی میں پیدا ہوئے۔ اردو، فارسی اور عربی کی ابتدائی تعلیم وطن میں حاصل کی۔ اعلا تعلیم کے لیے ۱۹۱۸ء میں ندوۃ العلماء، لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ وہاں انھوں نے شیخ محمد عرب، مولانا امیر علی، مولانا حیدر حسن خان ٹونکی (محدث) اور مولانا شبلی متکلم جیسے جید علماء سے اکتسابِ علم کیا۔ اب مزید تعلیم کے لیے وہ مصر

جانا چاہتے تھے لہٰذا اس مقصد کے تحت بمبئی پہنچے۔ لیکن آمد و رفت کا معقول انتظام نہ ہو سکا، اس لیے وہیں سکونت اختیار کرلی۔ انھوں نے بمبئی میں کچھ عرصے روزنامہ خلافت میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ بعد کو وہیں سے ۱۹۲۱ء میں ہفتہ وار جمہور مصوّر جاری کیا، جو آٹھ مہینے تک نکلتا رہا۔ اسی اثنا میں نیشنل ہیرالڈ اور ڈیلی مین کے لیے بھی مضامین لکھتے رہے۔

انھیں ۱۹۲۶ء میں مزید تحصیلِ علم کا شوق جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی کھینچ لایا۔ یہاں انھوں نے انگریزی کے درجے میں، جو اس وقت اسپیشل درجہ کہلاتا تھا، داخلہ لیا۔ اس نصاب کی تکمیل کے بعد وہ اپنے وطن کامٹی آنا چاہتے تھے، لیکن ڈاکٹر ذاکر حسین نے انھیں روک لیا اور درس و تدریس کی خدمت ان کے سپرد کردی۔ وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں ۱۹۴۳ء تک یہی فریضہ انجام دیتے رہے۔

جب نواب عثمان علی خان، والیِ حیدرآباد نے اپنے پوتوں کی تعلیم و تربیت کے لیے جامعہ سے اتالیق طلب کیا تو جامعہ کے ذمّے داروں نے اس منصبِ جلیل کے لیے ان کا انتخاب کیا۔ وہ اس خدمت پر پولس ایکشن حیدرآباد تک مامور رہے۔ پھر دو سال آصفیہ کالج حیدرآباد میں مدرّس کی حیثیت سے کام کیا۔ چونکہ وہ زمانہ پر آشوب تھا لہٰذا جامعہ لوٹ آئے اور نصابی کتابوں کی ترتیب و تالیف میں مصروف ہوگئے۔ ان کی نصابی کتابیں کشمیر، حیدرآباد اور علی گڑھ میں برسوں شاملِ نصاب رہی ہیں۔

ابھی جامعہ میں درسی کتابوں کی ترتیب و تالیف میں ہمہ تن مصروف تھے کہ آلِ احمد سرور نے انھیں انجمن ترقیِ اردو، ہند کے کاموں کی نگرانی کے لیے علی گڑھ بلوالیا۔ اس ادارے میں انھوں نے نائب معتمد کی حیثیت سے پندرہ سال کام کیا۔ پھر ڈاکٹر عابد حسین کی تحریک پر جامعہ لوٹ آئے اور اسلام اور عصرِ جدید کے نائب مدیر مقرر کیے گئے۔ اس کے بعد چند سال بمبئی میں اردو لغت کی تدوین و ترتیب کا کام کیا۔ اب اپنی بیٹی کے یہاں تمسر (ضلع بھنڈارہ) میں سکونت پذیر ہیں۔

انہوں نے متعدد علمی اور تحقیقی مضامین لکھے ہیں جو جامعہ، پیام تعلیم، کتاب نما اور نیا دور میں چھپ چکے ہیں۔ تعلیم بالغان کے تعلق سے ان کے کئی کتابچے شائع ہو چکے ہیں اور بچوں کے لیے بھی کئی مضامین زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ غرض علمی و تعلیمی اعتبار سے موصوف ایک بلند مقام رکھتے ہیں۔

طالب ۱۸۹۵ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کامٹی کے سرکاری اسکولوں میں ہوئی۔ بعد ازاں پٹوردھن ہائی اسکول، ناگپور سے ثانوی تعلیم حاصل کر کے الہ آباد یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ تعلیم سے فارغ ہوتے ہی انھیں اکاؤنٹنٹ جنرل آفس میں آڈیٹر کی اسامی مل گئی۔ جب ان کی عمر ۲۷ سال تھی، ۲۲ جون ۱۹۲۲ء کو ان کی زندگی کا چراغ گل ہو گیا۔ مسلم قبرستان کامٹی میں مدفون ہیں۔

اس وقت ان کے تین بیٹے زندہ اور سلامت ہیں۔ بڑے بیٹے محمد عزیز الدین مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف سیکنڈری ایجوکیشن ناگپور میں ملازم ہیں۔ محمد نعیم الدین محکمۂ ریلوے سے وابستہ ہیں اور محمد نسیم الدین انجمن جونیر کالج ناگپور میں اُردو کے لکچرر ہیں۔

طالب اردو، فارسی اور انگریزی زبان و ادب پر اچھا خاصا عبور رکھتے تھے۔ اچھے شاعر اور نثر نگار تھے اور ہمیشہ علمی و ادبی کاموں میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۲۰ء میں مودی، کامٹی میں ایک علمی ادارہ دار المعلومات قائم کیا تھا، جس کا تفصیلی ذکر علمی و ادبی اداروں کے باب میں کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ وہ مدرسہ اسلامیہ مودی، کامٹی کے بھی سکریٹری اور روحِ رواں تھے۔ کامٹی میں جدید تعلیم عام کرنے میں ان کا بھرپور حصہ ہے۔ نوجوانوں میں علمی ذوق پیدا کرنے اور ان کی ذہنی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لیے انھوں نے کافی کوششیں کی ہیں۔

اُن کی شاعری کی ابتدا طالب علمی کے زمانے میں ہوئی۔ اُن کے چھوٹے بھائی مولوی

حفیظ الدین صاحب سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ وہ میرٹھ کے کسی کہنہ مشق شاعر کے حلقۂ تلامذہ میں شامل تھے اور نعت، غزل، سلام، رمضان کے قصائد کے علاوہ نظمیں بھی لکھتے تھے۔ اُن کا کلام ایک عرصے تک اُن کے ورثا کے پاس محفوظ تھا لیکن دھیرے دھیرے وہ سب ضائع ہوگیا۔ کافی تلاش کے بعد ۲۵ بندوں پر مشتمل ایک نظم "قوم کی خدمت میں ایک درخواست" ملی ہے۔ انھوں نے یہ نظم پیر کے دن یکم شوال ۱۳۳۵ھ کو عید الفطر کی نماز کے بعد مدرسہ اسلامیہ، موودی کامٹی کے جلسے میں پڑھی تھی۔ اِسے انجمن اسلامیہ جبلپور نے ۱۹۱۷ء میں چھپوایا ہے۔ کتابچے کا سائز ۴×۶ اور ضخامت ۱۶ صفحات ہے۔ اِس پُراثر نظم کے چند بند پیشِ خدمت ہیں۔

دیکھتا ہوں جو کبھی قوم کی میں حالتِ زار　　آنکھیں ہو جاتی ہیں اس درد سے ابرِ خوں بار
آج ہے وقفِ خزاں قوم جو تھی رشکِ بہار　　اب تو اپنی بھی مدد کر نہیں سکتی زنہار

دیکھ لو وحش و طیور اپنی مدد کرتے ہیں
اپنی ہی قوتِ بازو کا وہ دم بھرتے ہیں

غیر قوموں کی تو اے قوم کبھی تھی سردار　　زیر و تابع تھے ترے تبت و چین و تاتار
گردشِ چرخ سے اب ایسی ہوئی زار و نزار　　نام لینا بھی ترا ان کے لیے ہے اب عار

کوئی دشمن بھی نہ یوں قوم پہ بیداد کرے
کہ جو امداد کے قابل ہو نہ امداد کرے

گو تری اگلی سی باقی نہیں وہ عظمت و شان　　رہ گیا نام ہی کو صرف ترا نام و نشان
مسجدوں میں نہیں پہلی سی نماز اور اذان　　مدرسے دین کے جتنے تھے ہوئے سب ویران

پھر بھی تو ہے وہی اور نام مسلمان ترا
رہبرِ کامل و مرشد وہی قرآن ترا

فیض قرآں ہی سے دنیا کو ہوا تھا حاصل　　اِسی رہبر نے تو اُمّی کو کیا تھا کامل
اِسی مصحف پہ تو اجداد تھے تیرے عامل　　روز و شب جن پہ ہوا کرتی تھی رحمت نازل

رشتہ جو حبلِ متیں کا تھا اُسے توڑ دیا
اس نے چھوڑا ہمیں جب ہم نے اُسے چھوڑ دیا

پھر تو سب جاہ و حشم کرنے لگے ہم سے سفر — کوچ پر ہو گئے تیار جو تھے علم و ہنر
ہو گئے ہم سے جدا صنعت و حرفت یکسر — تھا اخوت کا جو شیرازہ ہوا وہ ابتر

باہمی بغض و حسد سے یہ بلا آئی ہے
جنگ ہفتاد و دو ملت کی گھٹا چھائی ہے

ترکِ قرآں سے ہوا تفرقہ باہم پیدا — ایک اسلام میں جاری ہوئے مذہب صدہا
کیا اللہ نے مسلم کا لقب ہم کو عطا — جو رُسل کا تھا لقب ہم نے اسے ترک کیا

آدم و نوح و محمدؐ کا لقب تھا مُسلم
عیسیٰ و موسیٰ کو بھی حق نے بنایا مُسلم

طالبِ خستہ پئے قوم ہے رنجورِ الم — تابِ تحریر نہیں چلتا ہے رُک رُک کے قلم
کیا کرے دل سے رواں اُس کے ہے خونِ نابِ غم — حق ہے گو تلخ مگر اس کو پئیں اہلِ کرم

قوم مختار ہے چاہے اسے سمجھے بکواس
یا یہ سمجھے کہ عبث دل کی نکالی ہے بھڑاس

انور: ــــــــــ یار محمدؐ

نواری، ضلع فیض آباد کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ وہیں سے اُن کے والد حاجی شیخ امیر ۱۹۰۷ء میں کامٹی آئے۔ اس وقت انور کی عمر صرف سات سال تھی۔ اس طرح ان کا سالِ ولادت ۱۹۰۰ء قرار پاتا ہے۔

مولانا انور چار بھائی تھے۔ ان میں سے دو نے کافی مقبولیت حاصل کی۔ بڑے بھائی مولوی لعل محمدؐ صوفی منشی اور ایک اچھے عالم تھے۔ انھیں درس و تدریس سے گہرا لگاؤ تھا۔ سید غلام کبریا کے مرید تھے۔ بعد کو جب مرشدِ کامل کا درجہ حاصل کر لیا تو بہت سے لوگوں نے اُن کے ہاتھ پر بیعت کی۔ ان کا انتقال مارچ ۱۹۵۵ء میں ہوا۔

مولانا انور نے حافظ صفی اللہ کی نگرانی میں پہلے قرآن مجید کا ناظرہ ختم کیا پھر چودہ سال کی عمر میں حافظ ہو گئے ۔ فارسی منشی محمد اسحٰق سے پڑھی ۔ تمام عمر آبائی پیشہ پارچہ بافی معاش کا ذریعہ رہا ۔

زندگی سادگی، انکساری اور بُردباری میں بسر کی ۔ کم گو اور انتہائی مخلص تھے ۔ صوم و صلوٰۃ کے پابند تھے ۔ ۱۹۶۱ء میں حج کیا تھا ۔ اخیر تک رمضان کے مہینے میں تراویح پڑھاتے رہے ۔ غرض کہ بہت مذہبی اور پرہیز گار تھے ۔

جسمانی اعتبار سے شروع ہی سے کمزور اور نحیف تھے ۔ صحت عام طور سے کبھی اچھی نہیں رہی ۔ اچانک بروز بدھ، ۲۷ نومبر ۱۹۷۴ء (۱۲ ذی القعدہ ۱۳۹۴ھ) کو دن کے گیارہ بجے دل کا دورہ پڑا اور جان بحق ہو گئے ۔ اُسی دن عصر کے بعد مسلم قبرستان کامٹی میں سُپردِ خاک کیے گئے ۔ اِس مرگِ ناگہانی سے متاثر ہو کر اُن کے شاگردِ رشید شاطر حکیمی نے ۱۵ شعر کا قطعۂ تاریخ نظم کیا، جس کا آخری شعر یہ ہے :

کہدو شاطر یہ مصرعِ تاریخ
"قدوۂ بزم خوش بیاں نہ رہا" ۱۳۹۴ھ

عیسوی تاریخ عزیز قدوسی نے کہی ہے :

اُٹھ گئے بزم جہاں سے افسوس ! ناز تھا اہلِ سخن کو جن پر ۱+۱۹۷۳ء
از سرِ آہ کہا دل نے عزیزؔ حیف جاتے رہے حافظ انورؔ ۱۹۷۴ء

اُن کی شاعری کی ابتدا عشرۂ محرم کی مجالس سے ہوئی، جو کامٹی میں اُن کے عنفوانِ شباب میں بڑے اہتمام سے ہوا کرتی تھیں ۔ وہ بھی اِن مجلسوں میں شریک ہو کر سلام اور مرثیے پڑھا کرتے ۔ یہیں سے اُن کے ذوقِ شعری کو تقویت ملی ۔ بعد کو یہ شوق بتدریج بڑھتا رہا ۔ جب اُن کی شاعری کا باقاعدہ آغاز ہوا تو سعید نے رہبری کی ۔ انھوں نے آگے چل کر اس میدان میں اتنی ترقی کی کہ خود استادی کی منزل پر پہنچ گئے ۔ اِس علاقے میں اُردو شاعری کو فروغ دینے میں ان کی خدمات قابلِ قدر ہیں ۔ تلامذہ

کی ایک بڑی تعداد نے ان سے استفادہ کیا ہے ۔

ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ " تجلیاتِ انور ۱۹۷۱ء میں نیو کامٹی کلب کے زیرِ اہتمام چھپ چکا ہے ۔ ۹۲ صفحات کے اس مجموعے میں ۲ نعت ' ۱ منقبت ' ۴ سلام اور ۲۷ غزلیں ہیں ۔ ابھی بہت سا کلام غیر مطبوعہ حالت میں اُن کے ورثا کے پاس محفوظ ہے ۔

کلام استادانہ رنگ لیے ہوئے ہے ۔ ہر شعر سے پختگیِ فن اور قدرتِ زبان کا ثبوت ملتا ہے ۔ یوں تو کئی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے ' لیکن سچ یہ ہے کہ وہ خالص غزل کے شاعر تھے ۔ اُن کی غزلوں میں سلاست ' روانی ' متانت اور سنجیدگی پائی جاتی ہے ۔ نمونۂ کلام تجلیاتِ انور سے اخذ کیا گیا ہے :

جانا بھی چاہتا ہوں تری بزمِ ناز سے — پھر یہ بھی سوچتا ہوں کہ جایا نہ جائے گا
کسی کو فائدہ تڑپا کے مجھ کو — نگاہِ ناز کا یہ کام ہوگا

یہ اور بات ہے کہ تجاہل سے کام لیں — وہ خوب جانتے ہیں مرا مدعا ہے کیا
خلق مجھ سے ملنے کو دُور دُور سے آئی — تیری رہ گزر کا جب میں نے کچھ پتا پایا

اُس کو تری محفل میں تری دید سے ہے کام — کون آیا ' گیا کون ' یہ انور کو خبر کیا
شکوۂ جور کے سننے میں برائی کیا تھی — وہی کہتا جو تری شان کے شایاں ہوتا

جب تک وہ چشمِ شوق سے میری چھپا رہا — میں جلوہ گہ میں اُس کی تماشا بنا رہا
گنجائشِ نیاز تھی ہر اہلِ شوق کو — افسانہ بن گئی وہ تری انجمن کی بات

محسوس یوں ہوا کہ رگِ جاں ہی کٹ گئی — تنکا کوئی ہوا جو مرے آشیاں سے دور
کیا بنے ذکر مرا اُن کے لبوں کی زینت — ہوں وہ افسانہ کہ جس کا کہیں مذکور نہیں

حُسن کو سکتہ ' نگاہیں محوِ حیرت ' لب خموش — جان دینے کے لیے آیا ہے نذرانے میں کون
دیدۂ تر سے ٹپک کر آنسوؤں نے کیا کیا — صورتیں جو غم کی پنہاں تھیں نمایاں ہوگئیں
کہیں جہاں میں وفا کا نشاں نہیں ملتا — کہاں یہ کھو گئی جنسِ گراں تلاش کرو

ہونے دے بے نقاب اُنھیں بزمِ ناز میں — اے بے خودی ابھی سے نہ کر بے خبر مجھے
چھیڑنا تھا آپ کو خلوت میں ذکرِ غم مرا — اس طرح رُسوا نہ کرنا تھا سرِ محفل مجھے

اُن سے نہ بیاں ہوگا افسانہ مرے دل کا
کیا لے کے کروں گا میں تصویر کی گویائی

آئی بھی بہارِ انور، رخصت بھی ہوئی کب کی
اب تک ہے گریباں سے اُلجھا ہوا سودائی

بہت ہے، تھوڑی سی الفت کی زندگی ہم کو
کہو خضر سے مریں عمرِ جاوداں کے لیے

ناکامیوں کی دہر میں چلتی ہیں آندھیاں
روشن کہاں چراغِ تمنا کرے کوئی

ڈراتی ہیں چمک کر کیوں فلک کی بجلیاں مجھکو
بہت دیکھی ہے میں نے ان نگاہوں کی شرر باری

دنیا میں نہیں ہیں وہ مگر نام ہے باقی
کچھ لوگ اُبھر آئے ہیں دریائے فنا سے

حل تغافل کا مسئلہ ہو جائے
تم سمجھ لو اگر جفا کیا ہے

جلنے لے جاتی کہاں مجھ کو یہاں سے آگہی
شکر کرتا ہوں ابھی محفل میں دورِ جام ہے

حسن کا ہے یہ کرشمہ کہ نظر کا جادو
ذرہ ذرہ ترے کوچے کا جواں دیکھا ہے

دل میں رہ رہ کر بھڑک اٹھتے ہیں شعلے طور کے
کون سرگرمِ تجلی، میرے آب و گِل میں ہے

تکلیف اس قدر بھی گوارا نہیں اگر
اچھا مرے خیال میں آیا نہ کیجیے

ڈرتا ہوں کہیں اس کا تقاضا نہ کرے غیر
مخصوص جو اندازِ جفا میرے لیے ہے

شرابِ ناب سے خالی ہے میرا پیمانہ
بھری بہار میں ساقی یہ دل لگی کیا ہے

سیرِ نظارۂ عالم ہے فقط کہنے کو
جو یہاں ہے ترے جلوے کا تماشائی ہے

اشک سب اشک ہوا کرتے ہیں اے دیدۂ تر
اُن کے دامن پہ جو گرتا ہے، گہر ہوتا ہے

اپنے کرم کو اور مری سادگی کو دیکھ
کھاتا ہوں میں فریبِ تمنا ترے لیے

اطہر: ——— محمد عمر انصاری

محمد رستم احقر کے تایا زاد بھائی ہیں۔ ان کے والد حاجی عبدالرحمٰن سردار اپنے زمانے کی ایک با اثر اور قابلِ احترام شخصیت تھے۔ انھوں نے کامٹی میں بیش بہا سماجی خدمتیں انجام دی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ ان کا بے حد احترام کرتے تھے۔ ۲۷ دسمبر ۱۹۲۸ کو انتقال ہوا۔ ان کے سات بیٹے تھے: عبدالقدوس، محمد، عبدالشکور، محمد یوسف،

محمد عمر (اطہر)، داؤد اور محمد سلیمان ۔

اطہر ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے ۔ عربی اور فارسی کا نصاب وطن ہی میں مولانا شاہ زماں (ف: ۱۹۲۷ء) سے پورا کیا ۔ انگریزی کی تعلیم گورنمنٹ مڈل اسکول، کامٹی سے حاصل کی ۔ انھوں نے ۱۹۲۶ء میں رمنگٹن کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی تھی ۔ چونکہ عربی اور انگریزی زبان پر قدرت حاصل تھی، لہٰذا کمپنی نے انھیں بسلسلۂ تجارت بصرہ (عراق) بھیج دیا، جہاں تین سال مقیم رہے ۔ بعد کو کمپنی سے کسی معاملے میں اَن بَن ہوگئی تو ۱۹۳۲ء میں مستعفی ہوگئے ۔ بقیہ زندگی سماجی اور ادبی کاموں میں گزاری ۔ انھوں نے کامٹی سے ایک ساتھ دو پرچے جاری کیے ۔ ماہنامہ "دُرِ سخن" اور سہ روزہ "جمہور" ۔ اِس سے پہلے کامٹی سے کبھی کوئی اخبار یا رسالہ جاری نہیں ہوا تھا ۔

صحافت سے علاحدگی اختیار کرلینے کے بعد اب وہ سماجی کاموں میں حصہ لینے لگے، جس کے صلے میں کامٹی میونسپل کمیٹی کے کونسلر منتخب کیے گئے ۔ ۱۵ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو گلے کے کینسر سے جاں بحق ہوئے ۔ مسلم قبرستان، کامٹی میں تدفین عمل میں آئی ۔ وفات کی تاریخ انیس آغائیؔ نے کہی ہے :

مصرعِ تاریخِ رحلت اس طرح کہدو انیس "آہ صد افسوس مولانا عمر جاتے رہے"

۱۳۷۳ھ

اُن کی بیوی رابعہ بیگم کا، جو ناگپور کے ایک رئیس نقی سیٹھ کی بیٹی تھیں، ۱۹۵۰ء میں انتقال ہوا ۔ ان سے دو بچے ہوئے ۔ ایک بیٹی اور ایک بیٹا ۔ بیٹی جمیلہ بیگم، محمد رستم احقر کے بیٹے اظہار الحق سے بیاہی ہے ۔ بیٹے کا نام جمیل احمد ہے ۔

وہ اردو، فارسی، عربی، انگریزی، چاروں زبانوں پر عبور رکھتے تھے ۔ اردو اور انگریزی میں بے تکلف لکھتے تھے ۔ فارسی اور عربی میں اگرچہ کوئی تحریر نظر سے نہیں گزری، لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ان زبانوں میں بڑی روانی سے گفتگو اور تقریر کرتے تھے ۔ عربی کے عالم ہونے کے باوجود، اُن کی زندگی میں کئی طرح کی بے اعتدالیاں راہ پاگئی تھیں ۔ مثلاً

انھیں شراب نوشی کی بری عادت لگ گئی تھی، جس کے باعث وہ زہد و اتقا سے کوسوں دور ہو گئے تھے ۔ حالانکہ ابتدائی زمانے میں صوم وصلوٰۃ کے پابند رہ چکے تھے ۔

وہ ایک کامیاب نثر نگار اور بہترین غزل گو تھے، لیکن ان کے مزاج میں استقلال نہیں تھا ۔ اس لیے کوئی دیرپا کام نہ کر سکے ۔ حافظہ بہت اچھا تھا، لہٰذا جو کچھ کہا سب یاد تھا ۔ ضرورت پڑنے پر اپنی غزلیں سنا دیا کرتے تھے ۔ اپنی بے پرواہی اور لا اُبالی پن کی وجہ سے کبھی کوئی باقاعدہ بیاض تک نہیں رکھی ۔ اس لیے اُن کا سارا کلام ان کے ساتھ جاتا رہا ۔

مندرجہ ذیل غزلیں درِ سخن میں چھپی ہیں :

جذبۂ شوقِ سزا لذتِ تعزیر سے ہے [1] — قدرِ صحرائے جنوں، خانۂ زنجیر سے ہے
سعیٔ پیہم ہے مجھے، باعثِ صد رنگِ کمال — یعنی تقدیر بھی ششدر مری تدبیر سے ہے
خود مرا ذوقِ تباہی ہے، تباہی کا سبب — ہے گلہ تجھ سے، نہ شکوہ مجھے تقدیر سے ہے
دور اب زندگی و موت سے ہستی ہے مری — واسطہ جس کو نہ تخریب، نہ تعمیر سے ہے

لذتِ عرضِ تمنا ہے دعا سے مقصود
آپ سن لیجیے، مطلب کسے تاثیر سے ہے

[2] غضب ٹوٹا، قیامت آگئی بلبل کے شیون سے — صدائے الاماں والحفیظ آتی ہے گلشن سے
ہمارا چارہ گر بھی کم نہیں کم بخت دشمن سے — علاجِ زخمِ دل کرتا ہے ظالم، نوکِ سوزن سے
بہت ہی پھوٹ کر روتے ہیں مرے پاؤں کے چھالے — الجھتا دیکھ لیتے ہیں وہ جب کانٹوں کو دامن سے

یہ ممکن ہے کہ ہو پیدا، زمینِ شور سے سنبل
مگر ممکن نہیں اظہارِ وفا اس شوخِ پُرفن سے

[3] نہیں محتاجِ درماں، چارہ گر زخمِ جگر میرا — یہ ہے وہ زخم جو پیدا کرے گا اپنے مرہم کو

۱۔ درِ سخن (کامٹی) مارچ ۱۹۲۵ء ص : ۱۱

۲۔ ایضاً

۳۔ یہ اشعار ان کے شاگرد مرحوم نیاز انجم کی بیاض میں درج ہیں

مری فطرت عبارت ہے غمِ ہستی سے اے اطہر　　مری قسمت میں قسّامِ ازل نے لکھ دیا غم کو
یہ بھی کوئی مقام ہے خلوتِ راز کے لیے
کعبہ جدا بنائیے اپنی نماز کے لیے

غازی : ــــــــــ محمد عبدالوحید

نواب محمد عبدالوحید غازی آف گیوردھا اسٹیٹ (ضلع چاندہ)، ۱۹۳۷ء میں کامٹی آئے اور یہاں مسلسل اکیس برس مقیم رہنے کے بعد ۱۹۵۸ء میں باغ منزل ناگپور میں سکونت اختیار کرلی۔ ادبی اعتبار سے چونکہ ان کی زندگی کا سب سے اہم حصہ کامٹی میں گزرا ہے اور یہیں رہ کر انھوں نے زیادہ تر علمی و ادبی کارنامے انجام دیے ہیں لہٰذا اُن کا تذکرہ اِسی کتاب میں مناسب ہوگا۔

ان کے کوئی بزرگ بھونسلہ عہد (۱۷۲۸ء تا ۱۱ دسمبر ۱۸۵۳ء) میں کشمیر سے ہجرت کر کے وین گنگا کے کنارے ایک گاؤں میں آباد ہوئے۔ تجارت ان لوگوں کا ذریعۂ معاش تھی، جس میں بہت جلد ترقی کر کے انھوں نے گرد و نواح میں کثیر جایداد پیدا کرلی۔ کچھ عرصے بعد جب اِس خاندان کا رشتہ گیوردھا کے افغان خاندان سے ہوا تو بعد کو یہی لوگ ان کی وراثت و جایداد کے مالک ہوگئے۔

غازی ۲۱ اکتوبر ۱۹۰۷ء کو گیوردھا میں پیدا ہوئے اور کم سنی ہی میں اپنے والد نواب زین الدین کی وفات (۱۹ جنوری ۱۹۱۱ء) کے بعد تمام جایداد و املاک کے وارث ہوگئے۔ چونکہ ابھی کم عمر تھے، لہٰذا حکومت نے تمام انتظامات اپنے ذمّے لے لیے اور رئیس زادوں کی طرح ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ انھوں نے مختلف استادوں سے متعدد زبانیں اور علوم سیکھے۔ کچھ عرصے انجمن ہائی اسکول ناگپور میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔ انھیں اردو، فارسی، عربی اور انگریزی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ فارسی اور انگریزی بے تکلف بولتے اور لکھتے تھے۔ گونڈی، ہندی اور مراٹھی سے بھی قدرے واقف تھے۔

ان کا سب سے زیادہ محبوب مشغلہ مطالعۂ کتب تھا ۔ دولت کی کمی نہیں تھی اس لیے ہمیشہ کتابیں خرید کر پڑھنے کے عادی تھے ۔ اس طرح ان کے پاس کتابوں کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہو گیا تھا ۔ ان کے عظیم الشان کتب خانے میں مختلف علوم پر اردو، فارسی، عربی اور انگریزی میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں ۔

ان کی تندرستی عرصے سے خراب چلی آرہی تھی ۔ آخری تین چار برسوں میں حافظہ جواب دے گیا تھا، ہوش و حواس میں فرق آگیا تھا اور آنکھیں بھی موتیا بند سے متاثر ہو چکی تھیں، جس سے علم و فضل کا یہ پُتلا بے جان ہو کر رہ گیا تھا ۔ آخر کار جمعہ کے دن ۱۶ فروری ۱۹۷۹ء (۱۸ ربیع الاوّل ۱۳۹۹ھ) کو تقریباً شب کے دو ڈھائی بجے رحلت فرمائی ۔ اُسی دن بعد عصر جنازہ اٹھا اور زری پٹکا مسلم قبرستان ناگپور میں سپردِ خاک کیا گیا ۔ قطعۂ تاریخِ وفات عزیز قدوسی نے کہا :

شاعرِ عکاسِ فطرت، صاحبِ فکر و نظر	نام کی برکت سے جو اپنے وحید العصر تھے
ناز تھا علم و ادب کو جن کی ہستی پر عزیز	اِس جہاں سے ہائے وہ نوّاب غازی چل بسے

۱۳۹۹ھ

عیسوی تاریخ انیس آغائی نے کہی :

سالِ رحلت کہہ دو منقوطی انیس
نکتہ داں نوّاب غازی اُٹھ گئے ۱۹۷۹ء

ان کے اتالیقوں میں ایک عبدالحمید خان زیبا کوٹی، بی ۔ اے بھی تھے، جو اپنے وقت کے ایک بلند پایہ شاعر تھے ۔ نواب غازی نے انھی سے شاعری کا فن سیکھا ۔ ذہین و طبّاع تھے لہٰذا بہت جلد اس میں کامیابی حاصل کر کے خود استادی کا مرتبہ حاصل کر لیا ۔ ۲۰ برس کی عمر میں اُن کی شہرت صوبہ متوسط و برار میں ہر طرف پھیل گئی تھی ۔ شاطر حکیمی، ڈاکٹر رندھیر، شوکت جعفری، فروغ نقاش (مصنف شاہنامہ ہند)، تابش حلیمی اور اختر نظمی نے ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے ۔

بلاشبہ وہ ادبی دنیا کی ایک ممتاز اور پُروقار شخصیت تھے ۔ انھوں نے ہندوستان کے

بڑے بڑے شہروں میں ہونے والے کل ہند مشاعروں کی صدارت کی۔ مقامی اخبارات و رسائل کی سرپرستی کی اور انہیں مالی مدد پہنچائی۔ ان کا کلام یو۔پی اور پنجاب کے جرائد و رسائل میں امتیازی طور پر شائع ہوا ہے۔ افسوس! دیوان زیورِ طبع سے آراستہ نہ ہوسکا۔ البتہ ایک مختصر مجموعہ گلستانِ معرفت اور کئی کتابچے تلخیات (اردو)، ذکر و فکر (اردو)، مہاتما تیلو راجی کا خواب (اردو)، زمزمہ (فارسی)، دیہاتی دنیا (ہندی) اور وار اینڈ نیشن (انگریزی) چھپ چکے ہیں۔

گلستانِ معرفت ۱۹۳۲ء میں محبوب المطابع برقی پریس، دہلی سے شائع ہوا ہے۔ ۴۰ اصفحات کے اس مجموعے کا سائز ۵×۸ ہے۔ اس میں ان کی ابتدائی غزلیں اور نظمیں شامل ہیں۔ شروع میں خان بہادر حافظ محمد ولایت اللہ حافظ کا مقدمہ ہے۔ تلخیات چند حقیقت افروز نظموں کا مجموعہ ہے۔ ۱۸ صفحات کے اس کتابچے کو عبد الستار فاروقی نے الفاروق پریس کامٹی میں چھپوایا ہے۔

انھوں نے کئی صنفِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام میں تخیل کی بلند پروازی اور فصاحت و بلاغت پائی جاتی ہے۔ بندش اور خیال میں حاکمانہ جرأت موجود ہے۔ فارسی تراکیب، موسیقیتِ شعری اور تشبیہات و استعارات کی بھرمار ملتی ہے۔ فلسفے اور تصوف کے مشکل مضامین ملتے ہیں۔ پاکیزہ تغزل کے چھینٹے نظر آتے ہیں اور وہ مسائل بھی جن سے زندگی عبارت ہے۔ مختلف اصنافِ سخن کا انتخاب پیشِ خدمت ہے:

رخ نہ یوں پھیر ستم کوش نہ جا — بے وفا، عہد فراموش نہ جا
دل کو مشکل سے قرار آیا ہے — رحم کر راحتِ آغوش نہ جا
عرضِ عاجز، کوئی دشنام نہیں — غیض میں آ نہ دکھا جوش، نہ جا
شکل پر موت کے آثار نہ دیکھ — زندگی کا ہے ابھی ہوش نہ جا

دل رُبا تجھ سے نوائے غازی
نغمہ زائے لبِ خاموش نہ جا

آبدیدہ نہ یہاں شمعِ شبستاں ہونا — شبِ غم نیک شگونی نہیں گریاں ہونا
جبّہ وجیب گراں، دشتِ جنوں شل، آئے — اُف! وہ زنداں ہے مرا دست و گریباں ہونا
نظر ایسی کہ دلِ شیخ و برہمن غلطاں — ناوکِ ناز کا اللہ خطِ ایماں ہونا
وصل میں بھی یہ غمِ وصل، الٰہی توبہ — مرحبا آپ کا ہم دوشِ رگِ جاں ہونا

جانِ شیریں میں حلاوت نہ رہی اے غازی
قہر ہے بادہ گسارِ لبِ جاناں ہونا

نہ سہی دم تکلّم کہ اب اشک ہیں معانی — نہ صدا، نہ لفظ بندش، لبِ چشمِ تر زباں پر
کبھی تازِ بجلیوں کا، کبھی ٹوٹے تارے — یہ تجلیاں شبِ غم مری شاخِ آشیاں پر
کیا نگاہیں تھیں کہ روزنِ زیبِ زنداں ہو گئیں — پتلیاں خوش ہو کے دیوانے کی رقصاں ہو گئیں
داد بے پایاں وہاں، دامن یہاں کوتاہ تر — ولے بر حسرت تمنائیں پشیماں ہو گئیں
شہر ہے شہرِ خموشاں، کیا نشانِ رفتگاں — چند اینٹیں تھیں کہیں جزوِ بیاباں ہو گئیں

عیش کی وہ ساعتیں، غازی وہ شب بیداریاں
خوابِ زاہد بن چکیں، فردوسِ رضواں ہو گئیں

یارب کبھی تو جلوۂ جانانہ عام ہو — بازیچۂ نگاہ تماشائے عام ہو
رستے میں رہ نہ جائے تمنائے نامراد — چابک سوارِ عمر نہ یوں تیز گام ہو
نظارۂ جمال کی صورت دکھائیے — پردے سے تابہ کے یہ پیام و سلام ہو

گنگا کو پیچ و تاب ہے زمزم کو اضطراب
غازی نہ میکدے میں کہیں تشنہ کام ہو

دو قدم میں ہو گئی پہنائیِ دوراں تمام — اب کہاں لے جائیگی تو گردشِ پیہم مجھے
آنکھ میں آنسو، نہ لب پر خندۂ دنداں نما — غم ہو یا راحت کہاں اب حسِ بیش و کم مجھے

زندگی غازی، کتابِ معنیِ بیگانہ تھی
لطف دیتا ہی رہا یہ مصحفِ مبہم مجھے

مرحبا کیا دل رُبا شغلِ دلِ ناکام ہے — خونِ دل سے کام ہے اب زہرِ غم کا جام ہے

اضطرابِ ہجر کے سب مرحلے طے ہو چکے
ہچکیاں کچھ رہ گئیں ورنہ مجھے آرام ہے

شمع کی آنکھوں میں آنسو، چاند کا دل داغ داغ
سوگ میں غم خوار ہیں کیا زندگی کی شام ہے

مدعا کیا کہہ سکوں، لکنتِ زباں کی الاماں
تم مقابل ہو، تکلم لرزہ براندام ہے

خوں چکاں آنکھیں، پریشاں مو، لبِ گویا خموش
دیکھ جاؤ خوب تصویرِ غمِ ایام ہے

کشتنی تھے حضرتِ غازی مہم سر ہو چکی
اب زحمت دو قضا کو ختم قتلِ عام ہے

خوشا کرم کہ ترا غم رفیقِ راہ رہا
اگرچہ عشرتِ منزل نے بیوفائی کی

شکستہ پا ہی تن، روح پر بریدہ نہیں
امید ہے تری دہلیز تک رسائی کی

بس ایک آہ میں افسانہ کہہ گئے دل کا
وہ بے زبان جنہیں حسرت تھی لب کشائی کی

حنا کی طرح پسے شوقِ دست بوسی میں
سزا ملی ہمیں غازی یہ ناسزائی کی

چشمِ حیرت میں رہے، وہ آنکھ سے پردہ کیے
روئے روشن کے ندیدے چلمنیں تاکا کیے

خشک دو آنکھیں ہوئیں دیکھا نہ پھر سیلابِ نور
یوں ہزاروں سال شبنم ابر کو ترسا کیے

سلسلہ جنباں ہے شاید آج تک بانگِ الست
بازگشتِ نفس پر، ہر مرغِ دل ناچا کیے

شاد پہنچا کوئی غازی تا بہ منزل گاہِ دوست
یوں کس و ناکس سبھی راہِ طلب ناپا کیے

اللہ رے آب و تابِ رخِ بے حجاب کی
جالی تجلیوں نے بنا لی نقاب کی

سائے میں کاکلوں کے درخشانیِ جمال
گہنا گئی بہار، شبِ ماہتاب کی

کترائی سی نگاہ، یہ دزدیدہ التفات
آثار دے رہے ہیں خبر انقلاب کی

طغیانِ شوق اور یہ رفتارِ شرم و ناز
لہروں میں بہہ رہی ہیں قطاریں حباب کی

گفتارِ دلنواز، یہ شہنائیِ گلو
رگ رگ سے روح کھینچ گئی چنگ و رباب کی

غازی سرورِ چشم ہے اک حورِ آسماں
آنکھوں میں جنتیں اتر آئی ہیں خواب کی

اب چند نظمیں دیکھیے :

رہ نما ہی بے خبر ہیں جب صلوٰۃ و صوم سے
کیا فلاحِ قوم ہو پھر اُن کی ہائے قوم سے

کیا اثر صوتِ اذاں کا ہو عوام الناس پر
رہ نما خود صبحدم چونکے نہیں ہیں نوم سے

رہبرانِ قوم کا ایمان خود واثق نہیں
کیا ڈرے پھر قوم غازی آنیوالے یوم سے

ما مریداں رو بہ سوے کعبہ چوں آریم چوں
رو بسوے خانۂ خمار دارد پیر ما
(رہنمایانِ گمراہ)

جب نہ ذوق افزا یاراں گردشِ پیمانہ تھی
بزم آرائے تخیل، محفلِ رندانہ تھی

تھا خیالِ تیغ زن لشکر کشِ انجم سپاہ
جوہرِ شمشیر فاتح ہمتِ مردانہ تھی

لگ رہا تھا خرمنِ تخئیل میں انبار سا
کشتِ دہقاں گو ابھی نا آشنائے دانہ تھی

کارخانہ کھل چکا تھا، فنِ تعمیرات کا
بے نیازِ بام و در گو صورتِ کاشانہ تھی

آبیارِ صحنِ گلشن تھا، خیالِ باغباں
گو زمیں نا آشنائے سبزۂ بیگانہ تھی

حصر تھا غازی تخیل پر شہودِ کائنات
عالمِ تخئیل تھی دنیا ہمیں، دنیا نہ تھی
(ہنگامۂ خیال)

میں وہ شجاعِ رزم ہوں جو نہ شکست کھا سکے
تیغ وہ تیغ ہے مری آب نہ جس کی جا سکے

میری فنا فنائے دہر، میری بقا بقائے دہر
پیکِ قضا کی تاب کیا نقش مرا مٹا سکے

ہاتھ میں میرے سیفِ دیں، قلب میں عزم بالیقیں
یہ وہ قدم نہیں جسے، لغزشِ پا ہلا سکے

میری نظر میں نورِ حق، میرے جگر میں سوزِ حق
شمع یہ وہ نہیں جسے بادِ سحر بجھا سکے

میرا قیام دہر میں، مقصدِ نظمِ دہر ہے
فرض سے میرے کیا مجال کوئی مجھے ہٹا سکے

میرا جہاد راستی، جنگ مری برائے حق
غازیِ حق پرست پر کیا کوئی غالب آ سکے
(مجاہدِ اسلام)

اگر قطرہ ہے انساں بھی اس دریائے وحدت کا
بدی کیوں ہو گئی ہے خاصہ اس کی طبیعت کا

وجود اس کا اگر ہے شاخ اُس نخلِ مقدس کا
سبب کیا ہے گناہوں کی طرف پھر اسکی رغبت کا

جو ہے یہ جزو اُسی کل کا جو ہے عالم سے مستغنی
ہوا دنیا میں کیوں محتاج انساں ہر ضرورت کا

روان ہے خون انساں کا اگر حق کی حرارت سے — بھڑک اٹھتا ہے شعلہ کس طرح اس میں عداوت کا
خدا جانے حسد کی آگ کیوں جلتی ہے سینے میں — اگر انسان بھی پرتو ہے اس کے فضلِ رحمت کا
وہی خود جلوہ آرا ہے اگر انساں کی صورت میں — جہاں میں پھر یہ قصہ کیا ہے، دوزخ اور جنت کا
اُسی کے نور سے آنکھیں اگر انساں کی روشن ہیں — نہیں روشن ہے اس پر راز کیوں اس کی حقیقت کا
نہیں آتے سمجھ میں' وہ یہی اسرار ہیں غازی — یہیں پڑھتے ہیں سب یہ شعر حافظ کی نصیحت کا

حدیث مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا — (طلسم جزو کل)

باغ ہے بہار ہے' آب جوئبار ہے — چتر شاخسار ہے' سیر لالہ زار ہے
آؤ انتظار ہے' جان بے قرار ہے

یہ تموجِ صبا' خوشگوار جاں فزا — عطر بیز و مشکسا' واہ واہ مرحبا
آؤ انتظار ہے' جان بے قرار ہے

شاخ شاخ گل بکف' عندلیب صف بصف — برگ برگ چنگ و دف' راگ رنگ ہر طرف
آؤ انتظار ہے' جان بے قرار ہے

آبشار برق تاز' دلکشا و دل نواز — قطرہ قطرہ شیشہ باز' موج موج نغمہ ساز
آؤ انتظار ہے' جان بے قرار ہے

ابرِ تر سیاہ پوش' مست مست بادہ نوش — مغبچانِ مے فروش' خم بسر قدح بدوش
آؤ انتظار ہے' جان بے قرار ہے

یہ جلوسِ نرم گام' زرق برق ہفت فام — یہ سماں یہ جشنِ عام' تم نہیں تو سب حرام
آؤ انتظار ہے' جان بے قرار ہے — (باغ و بہار)

قطعات ملاحظہ کیجیے :

ہر چند عقل کم ہے' ذرا بے شعور ہیں — دنیائے شاعری کے مجدّد حضور ہیں
جب سے غزل سنی ہے مجھے بھی ہے اعتراف — فنی اگر نہیں متفنّی ضرور ہیں

ہر چند لفظ پند نہیں شیر و انگبیں
تنبیہہ مخلصانہ رہے دل میں جاگزیں

تریاق وفا دزہر سے ہے جائے اجتناب
دارو ہزار تلخ ہو مہلک مرض نہیں

رباعیات کے نمونے درج ذیل ہیں :

ناشائستہ روش بدلنا سیکھو
کب تک تہ غلط روی سنبھلنا سیکھو

ماہِ تاباں پہ قدم رکھنے والو
پہلے اپنی زمیں پہ چلنا سیکھو

خوش ہو کے ابھی چارۂ ناچار تو ہے
سامانِ تسلیِ دلِ زار تو ہے

غازی یہ غم خانہ خرابی کب تک
چھپر نہ سہی سایۂ دیوار تو ہے

تو کام اگر حسنِ عمل سے لیگا
محروم جزا حق نہ تجھے رکھیگا

رزاقی سے رب کی مایوس نہ ہو
جب دانت دیے ہیں تو چبینا دیگا

عادل : ــــــــــ محمد صفی اللہ

ضلع اعظم گڑھ میں ایک قصبہ بہادر گنج ہے۔ وہیں سے ان کے دادا شیخ محبوب ۱۸۵۷ء کے بعد کامٹی آئے تھے۔ وہ بہت نیک اور خدا ترس انسان تھے۔ عادل کے والد محمد رحیم اللہ صوم و صلوٰۃ کے بے حد پابند تھے۔ خدا نے انھیں حج کی سعادت بھی بخشی تھی۔ سوتی کپڑے کی تجارت ان کے معاش کا ذریعہ تھی۔ ۱۹۱۲ء میں رحلت فرمائی۔ عادل ان کے اکلوتے بیٹے تھے۔

عادل ۱۹۰۱ء میں پیدا ہوئے۔ چونکہ والد کا سایہ بچپن ہی میں سر سے اٹھ گیا تھا، لہٰذا ان کے چچا علیم اللہ نے ان کی کفالت کی اور تعلیم و تربیت کی ذمے داری لے لی۔ ابتدائی تعلیم مدرسۃ المسلمین، کامٹی سے حاصل کر کے محمد جعفر خان سے اردو کی کچھ کتابیں پڑھیں اور حافظ محمد شکر اللہ کے شاگرد ملانی کلثوم بی کی نگرانی میں قرآن مجید کا ناظرہ مکمل کیا۔ بعد کو ذاتی کوششوں سے اپنے علم میں اضافہ کرتے رہے۔

کسبِ معاش کے لیے ۱۹۳۱ء میں میونسپل پرائمری اسکول' کامٹی میں ملازمت اختیار کی' جس سے ۱۰ جنوری ۱۹۶۶ء کو رٹائر ہوئے۔ بقیہ زندگی خانہ نشینی میں گزاری۔ صحت ہمیشہ قابلِ رشک حد تک اچھی رہی۔ لیکن اخیر عمر میں نحیف ونزار ہو گئے تھے۔ اسی عالم میں اتوار' ۱۶ اگست ۱۹۸۱ء کو علی الصبح طائرِ روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گیا۔ اسی دن بعد ظہر' مسلم قبرستان کامٹی میں سپردِ خاک کیے گئے۔ یونس افسر نے تاریخِ وفات کہی ہے :

اب کہاں محفل میں اپنی آہ! وہ شاعر نواز
ہو گیا وائے جدا دلدادۂ شعر و سخن ۱۴۰۱ھ

عادل نہایت شریف النفس اور سادگی پسند تھے۔ تعلیمی اور سماجی کاموں میں پیش پیش رہتے تھے۔ اسی لیے ربانی ہائی اسکول' کامٹی کے لائف ممبرس کی فہرست میں اُن کا نام بھی شامل تھا۔ کامٹی کے شعری اور ادبی ماحول کو جاندار اور پُر اثر بنانے میں انکا بھرپور حصہ ہے۔ وہ انجمن ضیاء الاسلام نیا بازار' کامٹی کے سرگرم کارکن بھی تھے۔ یہ ادارہ علمی حیثیت کا حامل ہے۔

بچپن ہی میں شعر و شاعری کا شوق ان کے دل میں پیدا ہوا۔ اس میں سعید نے ان کی رہنمائی کی تھی۔ عادل' سعید کے سب سے آخری شاگرد تھے۔

عادل کی شاعری کے ابتدائی دور میں کامٹی میں غزل گوئی کا رواج عام تھا۔ لہجے اور طرزِ ادا پر لکھنؤ اسکول کے اثرات غالب تھے۔ عادل کو یہ روش پسند نہیں آئی چنانچہ انھوں نے غزل گوئی سے اجتناب کیا اور نظم کی طرف توجہ کی۔ ان کی زیادہ تر نظمیں قومی' ملی اور تاریخی موضوعات پر ہیں اور ان میں جذبات و تاثرات کی فراوانی ہے۔ بعض نظمیں اپنے دور میں کافی مقبول ہوئیں۔ مثلاً اچھوت اور ہندوستان' پیکرِ انصاف' مزدور اور سرمایہ دار وغیرہ۔ کوئی مجموعہ اب تک شائع نہیں ہوا ہے البتہ کچھ نظمیں اخبارات و رسائل میں چھپ چکی ہیں۔ ان کا شعری سرمایہ ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے۔ اب نظم

پیکرِ انصاف کے چند شعر درج کیے جاتے ہیں :-

ایک دن عیسائیوں نے کی گورنر سے رپورٹ
کیا اسی کا نام ہے انصاف اے مردِ خدا

شاہراہِ عام پر ہے اک بتِ عیسیٰ نصب
ایک آنکھ اس کی مسلمانوں نے زخمی کر دیا

اس قدر اندھیر ہم نے آج تک دیکھا نہیں
ظلم کی حد ہو گئی ہے اور ستم کی انتہا

جبر و استبداد ہم سہتے رہیں اور چپ رہیں
ملک کی جمہوریت کا کیا یہی ہے اقتضا

ایک بت کی بھی حفاظت جن سے ہو سکتی نہیں
کیا بچائیں گے ہمیں جب وقتِ جنگ آ جائیگا

ہے دلی مقصد ہمارا بتِ محمدؐ کا بنے
اور ہم کو چاہیئے کچھ بھی نہیں اس کے سوا

تاکہ ہم سب مل کے اس کی آنکھ کو زخمی کریں
ہے یہی منشا ہماری آج کی درخواست کا

جان کا بدلہ جان ہے، تو آنکھ کا بدلہ ہو آنکھ
دیکھنا ہے عدل ہم لوگوں کو آج اسلام کا

مدعی کا جب سنا دعویٰ تو ابن العاص کے
اڑ گئے ہاتھوں کے طوطے، ہوش عنقا ہو گیا

سوچے سمجھے زاویے کے تحت تھی درخواست آئی
مصطفٰے کا بت بنانا امرِ ناممکن ہی تھا

یکسوئی حاصل ہوئی جب حاکمِ اسلام کو
دیکھ کر اُن کی طرف از راہِ ہمدردی کہا

پھوڑ دو آنکھیں مری اس جرم کی پاداش میں
میں بصد اخلاص دیتا ہوں تمہیں اس کی رضا

میری خواہش ہے اسے منظور ہی کر لیجیے
اس سے بہتر اور دے سکتا ہوں کیا اس کا صلا

تھا جواں فریادیوں کے دل میں جوشِ انتقام
پھوڑنے کو آنکھ فوراً اک جواں آگے بڑھا

دادِ جرأت پہلے دی پھر حاکمِ اسلام نے
کھینچ کر خنجر کمر سے اس کے آگے رکھ دیا

بھر گیا اشکِ ندامت منتقم کی آنکھ میں
اور ابن العاص کے قدموں پہ اکدم گر پڑا

حاکمِ اسلام کے اس جذبۂ ایثار پر
عدل زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی فضا

جیسے ہی اس فیصلے کی شہر میں پہنچی خبر
حلقۂ اسلام میں ہر غیر مسلم آ گیا

ہے یہی تیغِ اخوت اور شمشیرِ کرم
ہے اسی تلوار سے اسلام پھیلا جا بجا

تو نے دیکھا ہے بہت کچھ لیکن اے چشمِ فلک
اس سے اچھا عدل دنیا میں کبھی دیکھا ہے کیا؟

حشر تک باقی رہے اس عدل کی تابندگی
آبِ زر سے اس لیے اس کو مورخ نے لکھا

آج عادلؔ نما کی ملتی نہیں ایسی مثال

سارا یورپ چھان مارا اور پورا ایشیا

نظم "اچھوت اور ہندوستان" کے چند بند ملاحظہ کیجیے :

تیرے دامن میں اچھوتوں پر تو اے ہندوستان
رات دن کرتے ہیں ظلم ہائے بیکراں
ہے زمیں ان کی مخالف اور دشمن آسماں
شرم آتی ہے تجھے کہتے ہوئے جنت نشاں
تو تو دوزخ کا نمونہ ہے اچھوتوں کے لیے
غیرتِ خلدِ بریں تجھ کو کوئی کیوں کر کہے

تجھ میں رہ کر اب تو یہ ممکن نہیں پائیں اماں
کوئی سنتا ہی نہیں بیچاروں کی جائیں کہاں
سہتے ہیں جور و جفا اور جھیلتے ہیں سختیاں
عالم بے چارگی میں لے رہے ہیں سسکیاں
کوئی پرساں ہی نہیں اس بے زباں ہستی کا آج
زیر دستی پر تسلط ہے زبردستی کا آج

تجھ کو اے ہندو بنایا جسنے عالی مرتبت
تو نے پائی جن کی کثرت سے سیاسی فوقیت
جسکے دم سے ہے تجھے حاصل یہ قدر و منزلت
آہ کر بیٹھا ہے ضبط ان کا حقِ انسانیت
محسنِ اعظم سے کیوں کرتا ہے اپنے سرکشی
رنگ لائے گی اچھوتوں کی بھی اکدن بے بسی

اب چند قطعات دیکھیے :

غوطہ زن دریا میں ہو کر گوہرِ مقصود لا
ڈھونڈتا ہے بیٹھ کر کیا خاک میں اکسیر تو
قسمتِ گیتی بدل دی جدِّ امجد نے ترے
اور ناداں کر رہا ہے شکوۂ تقدیر تو

خودستائی، خودنمائی، خودروی
دیکھ کر انسانیت ہے شرمسار
آگ سے پیدا ہوا ابلیس ایک
خاک سے پیدا ہوئے شیطاں ہزار

طغیانیِ عمل ہو تو دشوار کچھ نہیں
پایاب ہو کے رہتا ہے دریائے بیکراں
تسخیر کرے قوتِ برق و شرار کو
بارود کے پہاڑ پہ تعمیر کر مکاں

عزم کرلیں آج ہی ، ہم متفق ہوجائیں گے	اب مٹا کر ہی رہیں گے بغض و کینے کا نشاں
ایک شیرازے میں جو ہوتی نہیں ہے منسلک	چرخ سے گرتی ہیں ایسی قوم ہی پر بجلیاں

مضطر : ـــــ عبدالرحیم

حافظ عبدالرحیم مضطر ایک نیک سیرت ، پاک باطن ، خوش گفتار اور بلند مرتبہ انسان تھے ۔ وہ اپنی پُرخلوص شخصیت اور شاعری کی وجہ سے کامٹی میں بہت مشہور ہوئے ۔

ان کے والد کا نام محمد اسمٰعیل تھا ، جو جامع مسجد ، گجری بازار کامٹی میں مؤذن تھے ۔ انھیں درس و تدریس سے بھی دلچسپی تھی ۔ ۱۹۴۰ء میں رحلت فرمائی ۔ ان کے دو بیٹے تھے : عبدالرحیم مضطر اور محمد صغیر ۔

مضطر نے حاجی ملا عبدالوارث کے چھوٹے بھائی حافظ عبدالرحیم (ف ۱۹۱۵ء) سے قرآن مجید پڑھا ۔ انھی کی نگرانی میں اس کا حفظ بھی کیا اور اردو فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں ۔ ان کی علمی خدمات کی ابتدا ۱۹۲۹ء میں مدرسہ سراج المومنین کامٹی میں ایک مدرس کی حیثیت سے ہوئی ۔ جب ۱۹۳۵ء میں ربانی ہائی اسکول ، کامٹی کے شعبۂ دینیات میں ان کا تقرر ہوگیا تو اس ملازمت سے استعفیٰ دے دیا ۔ وہ جامع مسجد ، گجری بازار ، کامٹی کے امام بھی تھے ۔

سیاسی لحاظ سے مسلم لیگ کے زبردست حامی اور سرگرم کارکن تھے ۔ بچھتر سال کی عمر میں ، بروز منگل ، ۲۷ اکتوبر ۱۹۶۴ء کو انتقال ہوا ۔

انیس آغائی نے قطعۂ تاریخِ وفات کہا ہے :

نیک دل ، خوش کلام ، خوش اخلاق	شاعر و پیش امام حافظ تھے
دے کے فرقت کا داغ ہم سب کو	آہ ! مضطر سپردِ خاک ہوئے

۱۹۶۴ء

ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۳۵ء میں ہوئی۔ اس میں مولانا انور سے استفادہ کیا ہے۔ وہ زمانہ مسلم لیگ کے عروج کا تھا، لہٰذا مضطر لیگ کے جلسوں میں شریک ہو کر طویل نظمیں پڑھا کرتے اور اس کے ذریعہ لوگوں کو دعوتِ عمل دیا کرتے تھے۔ چونکہ ان کی نظموں کا انداز ناصحانہ اور حالی کے رنگ سے بالکل قریب تھا اس لیے عوام ان سے بہت متاثر ہوتے تھے۔

چند نمونے ملاحظہ کیجیے[1]:

ہے پیکرِ خیال جہاں سے بڑھا ہوا　　نظروں میں کارزار کا نقشا کھنچا ہوا
فتح و ظفر کا مالک و وارث بنا ہوا　　مسلم ہے زیرِ دامنِ خنجر پلا ہوا
رکھتا ہے آگے تیر کے سینہ تنا ہوا

غارتگروں کی جھڑکیاں کیوں کھائے کیا غرض　　ہاتھ اپنا ان کے سامنے پھیلائے کیا غرض
آزردگیِ دل انھیں بتلائے کیا غرض　　غیروں سے مانگنے کے لیے جائے کیا غرض
کافی ہے تیرے پاس خدا کا دیا ہوا

زندہ ہے تیرے نام سے آئینِ مصطفےٰ　　قائم ہے تجھ سے حوصلۂ شیرِ کبریا
قہر و غضب خدا کا ہے تیرا جاولا　　میدانِ کارزار سے پیچھے نہیں ہٹا
خنجر بکف قدم ترا آگے بڑھا ہوا

ہو کر کبھی خاک تیری اصالت نہ جائے گی　　جائے بلا سے جان شجاعت نہ جائے گی
پُر درد دل سے خوئے اخوت نہ جائے گی　　خاکِ وطن سے بوئے محبت نہ جائے گی
ہے خونِ دل شہیدِ وفا کا ملا ہوا

مضطر نہ فکر کیجیے روزِ حساب کی　　رحمت ہے بے نقاب رسالت مآب کی
دل میں ہے یاد زلفِ شہہِ بوتراب کی　　موجِ کرم ہے جوش پہ، چشمِ پُر آب کی
ہے موتیوں سے دامنِ مقصد بھرا ہوا

(مسلم)

۱۔ مضطر کا کلام ڈاکٹر محمد نظیر رشیدی سے فراہم ہوا ہے۔

رنگِ محفل ہے، فضا ہے، ابرِ خوش ہنگام ہے
نغمۂ تارِ نفس ہے، عیش کا پیغام ہے
نکہتِ گلشن ہے، ساقی ہے، سُبو ہے جام ہے
میکشو یہ رحمتِ باری کا آج اتمام ہے
کون ہے جو اس بھری محفل میں تشنہ کام ہے

نام تک لب پر نہیں ہے گردشِ ایام کا
مژدہ راحت فزا آغاز ہے انجام کا
خلق میں ہر سمت شہرہ ہے ہمارے نام کا
کیوں نہ ہو شاداب گلشن مذہبِ اسلام کا
خاطرِ ہستی کا اس پر بارشِ انعام ہے

کثرتِ غارت گرِ اقوام کا کچھ غم نہ کر
بے سروسامانیوں پر تو کبھی ماتم نہ کر
دردِ دل کے زخم کو منت کشِ مرہم نہ کر
غیر کے آگے سرِ تسلیم اپنا خم نہ کر
دولتِ دارین کا حاصل خدا کا نام ہے

تیرا پیکر ہے سراپا جلوۂ نورِ خدا
اک تجلی ہے تری برقِ نظر میں کیف زا
تیری شانِ بیخودی ہے بے نیازِ میکدہ
تشنۂ توحید کے سرمست کیا کہنا ترا
قطرہ قطرہ خونِ دل کا بادۂ گلفام ہے

اے سراپا غیرتِ دیں، پیکرِ عزت نواز
سر خدا کی نذر کر دے اور ہو جا سرفراز
توڑ دے قصرِ رعونت کو مٹا دے امتیاز
نشۂ دولت کے متوالوں سے ہو کر بے نیاز
تھام لے اس کے قدم جو خادمِ اقوام ہے

قومِ دیرینہ تجھے اب ہے بقا کے واسطے
متحد ہونا ہے پھر نشو و نما کے واسطے
کیوں شکارِ غم ہے ظلمِ ناروا کے واسطے
اب تو اس کی لاج تو رکھ لے خدا کیواسطے
جس کی ہستی کا سراپا صلح کا پیغام ہے

روزِ اوّل سے گدائے کوچۂ بطحا ہے تو
دولتِ کونین قدموں کے تلے رکھتا ہے تو
نامِ احمد پر خریدے تو کوئی بکتا ہے تو
تیری عزت کیوں نہ ہو مضطر غلام اس کا ہے تو
یوسفِ کنعاں بھی جس کا بندۂ بے دام ہے

(مسلمانوں سے خطاب)

خنجرِ مسلم سربازِ چمکتا دیکھیں — غازیِ دیں کا بلندی پہ پھریرا دیکھیں
شانِ اسلام سرِ ہند دوبالا دیکھیں — کفر کا دہریں بگڑا ہوا نقشا دیکھیں

اور تثلیث کا اترا ہوا چہرا دیکھیں

اک طرف بحرِ بلا خیز کی طغیانی ہے — اک طرف یاس والم، رنج و پریشانی ہے
اک طرف حرمتِ اقوام کی عریانی ہے — حرمِ پاک پہ غیروں کی نگہبانی ہے

چشمِ عبرت سے ذرا پوچھیے کیا کیا دیکھیں

اڑ گئی رونقِ گل، دورِ خزاں میں ہم ہیں — ہم میں ہیں دشمنِ جاں، دشمنِ جاں میں ہم ہیں
آبگینوں کی طرح موجِ رواں میں ہم ہیں — کیا اسی واسطے اے قوم جہاں میں ہم ہیں

غرق ہوتے ہوئے ملت کا سفینہ دیکھیں

عالمِ یاس میں ہم بے سروساماں ہو کر — چاک دل، چاک جگر، چاک گریباں ہو کر
دشتِ پرُخار میں محرومِ گلستاں ہو کر — محوِ حیرت ہیں کہ آئینۂ حیراں ہو کر

تابکے قوم کا بگڑا ہوا نقشا دیکھیں

(اے قوم)

انھوں نے کامٹی میں بخشی غلام محمد کی آمد کے موقع پر جو نظم کہی تھی، اس کے چند اشعار دیکھیے :

شکر ہے تیرا خدا اے کارسازِ دوجہاں — تو نے بخشا اپنی رحمت سے نشاطِ بیکراں
ذرہ ذرہ اس زمیں کا انجم افلاک ہے — منزلِ خورشید اس محفل میں فرشِ خاک ہے
سنگریزے صحنِ گلشن کے نگینے بن گئے — قطرۂ شبنم گلوں میں آبگینے بن گئے

آ رہی ہے کان میں پیہم یہ آوازِ نقیب — ساکنانِ کامٹی کا اوج پر آیا نصیب
مرحبا صد مرحبا، باشوکت و جاہ وحشم — عدل گسترِ حضرتِ بخشی کے آئے ہیں قدم

آپ کے قدموں پہ جھکتی ہے جبینِ کامٹی
اپنی قسمت پر ہے نازاں سرزمینِ کامٹی

ایک غزل ملاحظہ ہو :

سُنا ہے عرصۂ محشر میں خلقت شرمسار آئی
وہیں لینے بلائیں رحمتِ پروردگار آئی

مری ناکردگی نے مجھ کو پستی میں گرایا ہے
وگرنہ اوج پر تقدیر میری بار بار آئی

نہ کہنے پائے ان سے رہ گئے ہم دم بخود ہو کر
زباں پر جب تمنائے دلِ بے اختیار آئی

اِدھر خونِ تمنا ہے، اُدھر رنگینیِ گل ہے
بہار آئی ہے گلشن میں مگر ناسازگار آئی

اسیرانِ قفس ہم ہیں ہمیں کیا واسطہ اس سے
نشیمن پر گری بجلی کہ گلشن میں بہار آئی

مآلِ زندگی مضطر ہوا روشن پسِ مردن
مری فردِ عمل جب سامنے آئینہ دار آئی

منظر : ـــــــــ محمّد حنیف

اخضر کے حقیقی بھتیجے ہیں ۔ ان کے والد کا نام نصیر الدّین تھا جو سُوت کا کاروبار کرتے تھے ۔ وہ بڑے ہی دیندار اور متقی تھے ۔ حضرت عبداللہ شاہ سے گہری عقیدت رکھتے تھے ۔ تعلیمی اور سماجی معاملات میں بھی دلچسپی لیا کرتے تھے ۔ انھوں نے ۱۲ مارچ ۱۹۴۹ء کو رحلت فرمائی ۔ اگرچہ ان کے پندرہ لڑکے اور لڑکیاں تھیں، لیکن انتقال کے وقت ایک لڑکی اور پانچ لڑکے (محمّد حنیف منظر، محمّد یوسف سوز، محمّد اسمٰعیل جناح، محمّد اسحٰق (ف ۱۹۸۱ء)، محمّد یٰسین موجود تھے ۔

منظر ۱۹۰۷ء میں پیدا ہوئے ۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سراج المومنین کامٹی میں پائی ۔ چوں کہ والد نے ان کو اپنے ساتھ کاروبار میں شریک کر لیا تھا، اس لیے تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا ۔ وہ والد کی زندگی میں، اُن کے ساتھ تندہی سے کام کرتے رہے لیکن ان کی وفات کے بعد کسبِ معاش کے لیے مختلف پرائیوٹ فرموں میں ملازمت کرتے رہے ۔

شعر گوئی ۲۰ برس کی عمر میں شروع کی اور اس میں مولانا انور سے مشورہ کرنے لگے ۔ وہ اپنے مخصوص ترنم کی وجہ سے مشاعروں میں ہمیشہ کامیاب رہتے تھے ۔ عین

عیدالاضحیٰ کو جب کہ لوگ خوشیاں منا رہے تھے یک لخت دل کے درد کا شدید دورہ پڑا اور آناً فاناً رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ حادثہ بروز جمعرات، ۲ دسمبر ۱۹۷۶ء کو پیش آیا۔ انیس آغائی نے تاریخِ وفات کہی:

دن جمعرات، عید قرباں کو — تھا مبارک خوشی کا یہ موقع
ایسے عالم میں ناگہاں، افسوس — "آج منظر کا ہو گیا صدمہ"

۱۳۹۶ھ

نمونے کے چند شعر دیکھیے:

جو سفر سے نہ آج تک لوٹا — اس مُسافر کی یاد آئی ہے
بند کر لیں تری فرقت میں تڑپ کے آنکھیں — آج بیمار کو آرام ملا ہے ساقی
ساقی نگہِ مست اگر اپنی اٹھا دے — میخانے میں چلتا ہوا پیمانہ ٹھہر جائے
ہو چاک گریباں بھی تو کچھ کم نہیں منظر — ڈر ہے کہیں شیرازۂ ہستی نہ بکھر جائے

آنسو ہماری آنکھ کے کہہ دیں گے رازِ دل
دردِ فراق ہم سے چھپایا نہ جائے گا

کہیں طوفان بن کر میری ہستی کو نہ لے ڈوبے — الٰہی خیر، چشمِ شوق پُرنم ہوتی جاتی ہے
یہ کس کی زندگی کا ہو چلا ہے ختم افسانہ — چراغِ صبح کی کیوں روشنی کم ہوتی جاتی ہے
نکالا ہے نیا انداز اُس نے دل کے لینے کا — مری جانب عنایت کی نظر کم ہوتی جاتی ہے

یہ کیوں چھائی ہوئی ہیں ہر طرف مایوسیاں منظر
طبیعت ان دنوں کیوں خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے

کمالِ لذتِ ذوقِ اسیری اسکو حاصل ہے — کہ ہر موسم میں جسکی زندگی گذری ہو زنداں میں
فقط اک آہِ سوزاں سے لرز اُٹھا دلِ محزوں — ابھی تو کھیلنا ہے آگ سے صحنِ گلستاں میں

شاطر حکیمی : ——— غلام محی الدّین

ایک معزز اور صاحبِ علم گھرانے کے فرد ہیں۔ ان کے مورثِ اعلا سلطان محمود غزنوی کے عہد میں عرب سے ہندوستان آئے اور لکھنؤ میں اقامت گزیں ہو گئے۔

بعد کو نواب گنج (ضلع بارہ بنکی) میں مستقل سکونت اختیار کرلی۔

دادا کا نام حاجی مرکاءاللہ ابن شیخ بدیع الدین مدار تھا، جو نواب سعادت علی بہادر کے یہاں داروغہ میر ساماں تھے۔ وہ ۱۲۷۴ھ (۱۸۵۷ء) میں بغرضِ حج مکہ مکرمہ روانہ ہوئے۔ ابھی جدہ میں تھے کہ سفرِ آخرت پیش آگیا۔ ان کے ہمراہ ان کے بیٹے عبدالحکیم اور اہلیہ بھی تھیں۔ یہی عبدالحکیم، شاطر حکیمی کے والد ہیں۔

شاہ عبدالحکیم اپنے وقت کے ایک بلند پایہ عالم اور صوفی تھے۔ ان کی ولادت محرم ۱۲۶۰ھ (۱۸۴۴ء) میں صفدر گنج (ضلع بارہ بنکی) میں ہوئی۔ چونکہ حج کے سفر میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔ لہٰذا اپنی والدہ کے ساتھ مکہ مکرمہ تشریف لائے۔ اسوقت حاجی امداداللہ مہاجر مکیؒ وہیں مقیم تھے، چنانچہ شاہ عبدالحکیم کی والدہ نے انھیں مہاجرِ مکیؒ کے حوالے کر دیا۔ وہ ان کی خدمت میں پانچ سال رہے؛ ان سے عربی سیکھی؛ ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور اسی اثنا میں پانچ بار فریضۂ حج ادا کیا۔ ربیع الاول ۱۲۸۴ھ (۱۸۶۷ء) میں ہندوستان واپس آئے۔

اب اپنے وطن میں انھوں نے مولوی شیر علی وکیل سے، جو اُن کے رشتے دار تھے، فارسی کی چند معیاری کتابیں پڑھیں اور اس میں اچھا خاصا عبور حاصل کرلیا۔ انھیں ابتدا سے تصوّف و سلوک سے دلچسپی ہوگئی تھی۔ لیکن چونکہ ان منزلوں کا کسی مرشدِ کامل کی رہبری کے بغیر طے کرنا سخت مشکل ہوتا ہے، اسلیے تحصیلِ علم کے بعد وہ اسی جستجو میں رہنے لگے۔ آخر کار فرخ آباد کے ایک مشہور بزرگ شاہ طالب حسین (مصنف جامِ جم) کے آستانے پر انھیں کامل سکون میسّر آگیا اور ۱۲۹۲ھ (۱۸۷۵ء) میں ان کے مُرید ہوگئے۔ اب وہ فرخ آباد ہی میں کئی دنوں تک مقیم رہے اور شیخ کی نگرانی میں عبادت و ریاضت اور مجاہدہ کیا۔ بعد کو شیخ نے انھیں حلّۂ خلافت زیب تن کرکے رخصت کر دیا۔

اس کے بعد انھوں نے رشد و ہدایت کے لیے سیر و سیاحت شروع کر دی اور کئی مقامات کا سفر کرتے ہوئے ناگپور پہنچے۔ وہ کامٹی ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۷ء) میں آئے اور

یہیں اپنے خسر خدا بخش کے مکان میں، جو اُن کی بیوی کو ترکے میں ملا تھا، مستقل سکونت اختیار کرلی اور جب تک زندہ رہے درس و تدریس اور سلسلۂ بیعت سے لوگوں کو مستفیض فرماتے رہے۔ اُن کا انتقال بروز اتوار، ۱۹ نومبر ۱۹۱۶ء (۲۲ محرم الحرام ۱۳۳۵ھ) کو ہوا۔ مزار مسلم قبرستان کامٹی میں ہے۔ اس پر ان کے ایک عقیدت مند حاجی حسن دادا نے پختہ مقبرہ بنوا دیا ہے۔

ان کی وفات کی تاریخ سعید کامٹوی نے کہی ہے:

صوفی عبد الحکیم، اہلِ کمال | صاحبِ فیض شوکت و حشمت
ہائے بائیسویں محرم کو | آپ نے کی جہان سے رحلت
قربِ مولا انھیں نصیب ہوا | کرتے ہیں سیرِ گلشنِ جنت
طالبوں کو نظر نہیں آتی | وائے حسرت وہ چاند سی صورت
ٹکڑے ٹکڑے ہے زہرِ غم سے جگر | یہ مریدوں کی ان کے ہے حالت

کندہ لوحِ مزار پر ہو سعید
نیک دل، باصفا کی ہے تربت ۱۳۳۵ھ

انھوں نے یکے بعد دیگرے چار شادیاں کیں۔ پہلی شادی ان کے کسی رشتے دار کی بیٹی سے ہوئی تھی، لیکن تھوڑے ہی دنوں بعد اس کا انتقال ہوگیا۔ دوسرا نکاح ماموں کی بیٹی سے ہوا، وہ بھی انھیں داغِ مفارقت دے گئی۔ پھر تیسرا نکاح ناگپور میں مدار شاہ کی لڑکی سے ہوا، مگر کچھ عرصے بعد اس بیوی نے بھی ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ چوتھا نکاح ناگپور ہی میں ۱۳۰۲ھ (۱۸۸۵ء) میں خدا بخش کی صاحبزادی سے ہوا۔ ان سے دو بیٹے (عبد الرب اور غلام محی الدین شاطر حکیمی) اور ایک بیٹی ہوئی۔

انھیں تصنیف و تالیف سے مزاولت تھی۔ ان کی ایک کتاب نظائرِ سلوک، ابو العلائی پریس، آگرہ سے چھپ چکی ہے۔ اس میں انھوں نے مولانا روم کے تین شعر کی منظوم شرح فارسی میں تفصیل سے لکھی ہے۔ دوسری کتاب

ہدایت الطالبین غیر مطبوعہ حالت میں ان کے خاندان میں محفوظ ہے ۔ اس میں تصوف وسلوک پر روشنی ڈالی ہے ۔

شاطر حکیمی کے بڑے بھائی صوفی عبدالرب بھی علم وفضل والے تھے ۔ وہ ۱۳۰۵ھ (۱۸۸۶ء) میں کامٹی میں پیدا ہوئے ۔ پی ایم جی آفس ناگپور میں آڈیٹر تھے ۔ ان کا اردو میں کچھ کلام بھی ملتا ہے ۔ موجد ان کا تخلص تھا ۔ اردو نثر بھی اچھی لکھتے تھے ۔ ان کے دو رسالے حالاتِ حکیم اور رسالۂ تصوف مخطوطے کی شکل میں ان کے بیٹوں کے پاس محفوظ ہے ۔ ان کا انتقال ۲۴ دسمبر ۱۹۶۹ء کو ہوا ۔

شاطر حکیمی یکم مئی ۱۹۱۲ء کو پیدا ہوئے ۔ چونکہ والد کا سایہ کم سنی ہی میں سر سے اُٹھ گیا تھا لہٰذا صوفی عبدالرب نے ان کی تعلیم وتربیت کا اہتمام کیا ۔ انھوں نے اردو فارسی کی ابتدائی تعلیم اپنے برادرِ بزرگ سے حاصل کی اور مولانا محمد ابراہیم پشاوری سے گلستاں پڑھی ۔ انہی ایام میں مدرسہ سراج المومنین کامٹی میں داخلہ لیا لیکن گھریلو ذمے داریوں کی وجہ سے تعلیم کا سلسلہ باقاعدہ جاری نہ رہ سکا ۔ بعد کو جب مالی پریشانیوں سے نجات ملی تو جامعہ عربیہ اسلامیہ ناگپور سے مولوی کا نصاب مکمل کیا ۔

خوش قسمتی سے ۱۹۴۲ء میں انھیں منشی محمد فیض اللہ فیض کی کوششوں سے میونسپل اردو پرائمری اسکول کامٹی میں مدرسی کی جگہ مل گئی ۔ یہاں سے مئی ۱۹۷۷ء میں رٹائر ہوئے ۔ اب خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں ۔

انھوں نے ۱۹۳۱ء میں شاعری شروع کی ۔ ابتدا میں مولانا انور سے اصلاح لی ۔ پھر نواب غازی سے مشورہ کرتے رہے ۔ کافی مشق ومزاولت اور اساتذہ کی صحبت کا یہ اثر ہوا کہ ان کا کلام زبان وفن کے پہلو سے بے عیب ہوگیا ۔ اب خود استادی کا درجہ حاصل کرلیا ہے ۔

کلام کا ایک مختصر مجموعہ موت وحیات چھپ چکا ہے ۔ اسے سی ۔ پی اردو اکاڈمی ناگپور نے اکتوبر ۱۹۴۴ء میں مطبعِ ابراہیمیہ حیدرآباد سے چھپوایا ہے ۔ ضخامت ۱۵۶

صفحات اور قیمت ۲ روپے چار آنے ہے۔ منظومات سے پہلے عبدالستار فاروقی کا تعارف (۵ تا ۱۱) اور سید محی الدین قادری زور کا پیش لفظ (۱۲ تا ۱۵) ہے۔ کلام صفحہ ۱۷ سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں ۴۶ غزلیں اور ۵۳ نظمیں شامل ہیں۔ وہ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ لیکن ترقی پسند ادب سے متاثر ہو کر متعدد نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کے یہاں قطعات اور رباعیاں بھی ملتی ہیں۔ کلام میں رنگارنگی اور زندگی پائی جاتی ہے۔ ذیل میں نمونے کے طور پر کچھ کلام درج کیا جاتا ہے:

جاگ اُٹھے عدم آباد کے سونے والے
صبحِ محشر ہے کہ ظالم تری انگڑائی ہے

حال دیوانۂ الفت کا وہی ہے کہ جو تھا
فرق اتنا ہے کہ اب خود کا تمنائی ہے

کہتے کہتے کوئی چُپ ہو گیا افسانۂ شوق
ہائے کس وقت کہا تو نے کہ نیند آئی ہے

ہزاروں واقعاتِ عشق سے معمور ہے سینہ
مری ہر سانس کے ہمراہ اک افسانہ آتا ہے

جاتے جاتے دے گئے تابِ شکیبائی کی داد
جینا مشکل تھا ہوا مرنا بھی اب مشکل مجھے

تو نہ ہوتا تو زندگی کیا تھی
اے غمِ عشق تیری عمر دراز

تم نہ سمجھو تو کیا کرے کوئی
دل کا ہر مدعا نگاہ میں ہے

سبب پوچھا گیا تھا مجھ سے میری خستہ حالی کا
تمہارا نام لب پر آ گیا ہوتا تو کیا ہوتا

شبِ ہجراں گزار دی ہم نے
روزِ محشر تو کس شمار میں ہے

کتنے ہی درد و غم کی دوا بن کے رہ گیا
میرے قریب آکے ترا دیکھنا مجھے

آواز دی گئی کبھی اتنے قریب سے
دشوار ہو گیا ترا پہچاننا مجھے

دل میں اک محشرِ خاموش سمٹ آیا ہے
حال پوچھو نہ شبِ ہجر کی تنہائی کا

محبت کی رُودادِ غم اللہ اللہ
ٹپکنے لگا آج پتھر سے پانی

گفتگو ہو کہ خامشی تیری
یہ بھی قاتل ہے، وہ بھی قاتل ہے

جس قدر دُور جا رہے ہو تم
اور نزدیک آ رہے ہو تم

غم کی روداد پوچھنے والے
آنسوؤں کی زبان ہوتی ہے

عارضِ لالہ فام پر رنگِ ملال دیکھ کر
میں نے کہا خفا ہو تم کہنے لگے کہ "جی نہیں"

شرحِ جاں سوزیِ غم اور تو کچھ یاد نہیں
آپ پہلو سے اُٹھے تھے کہ دھواں دل سے اٹھا

نظم مزدور کی زندگی کے چند اشعار دیکھیے

دوپہر کا وقت گرما کی ہوائیں تیز تیز
مہر کی تابش سے پگھلے جا رہے ہیں دشت و در

گرم ہے نہروں کا پانی، سرد ہے نبضِ بہار
خشک پتے جیب و دامن کر رہے ہیں تار تار

تند جھونکے آ رہے ہیں دامنِ کہسار سے
سرزمینِ رنگ و بو پر آگ برساتے ہوئے

ہائے وہ مزدور جس کے پائے ہمت پر نثار
سنگدل سرمایہ داری کا سرِ ناپائیدار

جس کے بل بوتے پہ اتراتی ہے لیلائے زمیں
جس کی ہیبت سے لرز جاتا ہے چرخِ چنبریں

ڈوبتی نبضوں میں دوڑاتا ہے جو خونِ حیات
جس کے دم سے جگمگا اٹھتی ہے بزمِ کائنات

جس کی نظروں سے چمکتا ہے تمدن کا شباب
سرنگوں ہے جس کے آگے عہدِ نو کا آفتاب

ہو نہیں سکتا کہ وہ آرام لے دن کو کبھی
کفر ہے مذہب میں اس کے کاہلی کی زندگی

زندگی کیا موت سے ڈرتا نہیں مردِ حزیں
پھر بھی اس دنیا میں کوئی پوچھنے والا نہیں

امن کے متعلق چند اشعار ملاحظہ کیجیے :

امن ہے زندگیِ قوم و وطن کی معراج
موت ہر فتنۂ محشر کے لیے اس کا رواج

امن ہے طائرِ تہذیب کی پرواز کا نام
حرم و دیر کی پاکیزہ تر آواز کا نام

امن ہے عزمِ حسینی کا نشانِ محکم
سایہ تک اس کا یزیدوں کے لئے تیغِ دودم

امن ہے لوحِ تشدد کے لئے ضربِ شدید
حاملِ نقص و تباہی کو جہنم کی وعید

امن ہے قصرِ تمدن کی فلک بوس فصیل
خواب آسودہ معاروں کے لیے بانگِ رحیل

امن تنظیمِ جہاں، امن ہے تعمیرِ بقا
یہ نہ ہو تو ابھی ہو جائے قیامت برپا

سوز : ——— پنڈت گرداس رام

سوز ۲۴ اگست ۱۹۱۲ء کو ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے۔ وہ تقریباً ۲۴ سال بسلسلۂ ملازمت کامٹی میں مقیم رہے۔ پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف ڈپارٹمنٹ، ناگپور میں ہیڈ کلرک تھے۔ اس منصب سے ۱۹۷۲ء میں رٹائر ہوئے تو پھر اپنے وطن ہوشیار پور لوٹ گئے۔ وہیں کچھ عرصے بعد رحلت فرمائی۔

انھوں نے دہلی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا۔ وہیں طالبعلمی کے زمانے میں ان کی شاعری کا آغاز بھی ہوا۔ دہلی میں آغا قزلباش دہلوی کو اپنا کلام دکھایا کرتے تھے۔ کامٹی میں نواب غازی آف گیوردھا سے مشورہ رہا۔

وہ ایک اچھے انسان تھے۔ مشرقی تہذیب کے دلدادہ تھے۔ انتہائی مخلص، ملنسار اور احباب نواز تھے۔ کم گوئی اگرچہ ان کی فطرت کا خاصہ تھی لیکن برجستہ گوئی میں باکمال تھے۔ شرافت، محبت اور قومی یک جہتی کا پیکر تھے اور دل کی گہرائیوں سے انسانیت کی قدر کیا کرتے تھے۔

وہ ایک فطری شاعر تھے۔ غزلوں کے علاوہ قطعات اور رُباعیاں بھی کہی ہیں۔ ان کے اشعار میں سوز و گداز اور جذبات کی گہرائی ملتی ہے۔ نمونۂ کلام مختلف ذرائع سے جمع کر کے پیش کیا جا رہا ہے:

اپنی ہستی کو اگر سمجھا تو یہ سمجھا ہوں میں
نقشِ باطل ہوں جہاں میں محض اک دھوکا ہوں میں

عشق کی غارت گری سے میں تو ناواقف رہا
لوگ کہتے ہیں سرِ بازار اب رُسوا ہوں میں

اب یہ دل جھوٹی تسلی سے بہلتا ہی نہیں
لاکھ ہو تیرا تصور، بن ترے تنہا ہوں میں

جانے کن کن منزلوں سے اب گزرنا ہے مجھے
جو سمندر سے نکل آیا ہے وہ قطرہ ہوں میں

گو مقدر میں نہیں میرے کلی تک باغ کی
گُل تلا کرتے ہیں جس پر سوز وہ کانٹا ہوں میں

---

۱ - نذرِ ادب : ص ۱۲

گوارا کر ہی لینگے تلخیِ ایامِ دوراں کو مگر ہونے نہ دیں فاش اُن کے رازِ نہاں کو[۲]
ابھی سے جب یہ عالم ہے تو کیسے رات بیتے گی چلو غرقابِ مے کر دیں خیالِ شامِ ہجراں کو
الٰہی حرف آتا ہے تری شانِ کریمی پر رہینِ شکر جب پاتا ہوں فاقہ مست انساں کو
اُتر آئے جو زر کے واسطے ایماں فروشی پر ہو جس کا دین پیسہ ہی سلام ایسے مسلماں کو

یہ دنیا قید خانہ ہے، یہاں تعمیر خانہ کیا
بنانے کو بنا لو سوز تم زنداں میں زنداں کو

دنیا کے زخم وقت کے مرہم نے بھر دیے[۳] اک میرا زخم ہے کہ جو اب تک ہرا رہا
اب میرے لینے دینے کا دنیا کرے حساب میں جا رہا ہوں چھوڑ کے جو کچھ رہا رہا
باز آئے زندگی سے اگر زندگی ہے یہ ہر ہر قدم پہ ایک نیا مرحلہ رہا

دیدہ بتاں ہی سوز کو دیدِ خدا رہی
پرتو بشر اسی کا ہے وہ دیکھتا رہا

قطعات کے نمونے دیکھیے :

اللہ اللہ شدتِ فاقہ کشی[۴] پیٹ میں روٹی کا اک ٹکڑا نہ تھا
کیوں نہ نیچے ریل کے کٹتا غریب زہر کھانے کے لیے پیسہ نہ تھا

دل کے زخموں کو میں بھی سی لیتا[۵] غم کو پانی سمجھ کے پی لیتا
کاش ہوتی نہ مجھ میں حسِ لطیف میں بھی لوگوں کی طرح جی لیتا

۲۔ خیال کامٹی، جنوری ۱۹۶۱ء، ص: ۳۸
۳۔ ظہیر وارثی کے شکریے کے ساتھ
۴۔ خیال کامٹی، مئی جون ۱۹۵۷ء، ص: ۳۰
۵۔ ایضاً

سوز خضرائی : ـــــــ محمد یوسف

منظر کے حقیقی بھائی ہیں ۔ یکم جنوری ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے ۔ ان کے والد رئیسوں میں تھے، اس لیے بچپن اور جوانی کا زمانہ بے فکری میں بسر ہوا ۔ انھوں نے اردو، فارسی کی ابتدائی تعلیم مدرسہ سراج المومنین کامٹی میں حکیم عبدالحمید فاروقی، سید غلام رسول، مولوی شبلی اور عبدالستار خان سے حاصل کی ۔
گورنمنٹ اے وی ایم اسکول، کامٹی سے مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا ۔ اس کے بعد سینٹ جان ہائی اسکول، ناگپور میں ۱۹۳۲ء میں داخلہ لیا ۔ بدقسمتی سے دسویں درجے میں پہنچ کر اس بری طرح بیمار ہوئے کہ تعلیم ادھوری رہ گئی ۔ لیکن انھیں پڑھنے لکھنے کا بے انتہا شوق تھا ۔ وہ صحیح معنوں میں طالبعلم تھے، اس لیے جو کمی درسی اور امتحانی تعلیم سے ادھوری رہ گئی تھی اسے ذاتی مطالعے سے پورا کیا اور اپنی محنت اور سلیقے سے وہ کمال حاصل کیا کہ کئی زبانوں اور مضامین پر قدرت حاصل ہو گئی ۔
ان کی زندگی کا بڑا حصہ درس و تدریس میں گزرا ہے ۔ ۱۹۴۲ء میں نو بھارت ہائی اسکول کامٹی میں مدرس کی حیثیت سے ان کا تقرر ہوا ۔ جب ۱۹۴۶ء میں یہ اسکول سیٹھ رام ناتھ لوہیا ہائی اسکول میں شامل کر لیا گیا تو ان کی نوکری جاتی رہی ۔ اس کے بعد کانونٹ اسکول کامٹی اور سدا شیوراؤ پاٹل ہائی اسکول، کامٹی میں کچھ عرصے پارٹ ٹائم ٹیچر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ بعد کو ٹیوشن کا سلسلہ جاری کیا، جو اب تک قائم ہے ۔ ہائی اسکول، بی ۔ اے اور ایم ۔ اے کے طلبہ و طالبات کو انگریزی، ہندی، مراٹھی، اردو، عربی، فارسی، تاریخ، جغرافیہ اکنامکس، سوشیالاجی، پولیٹیکل سائنس غرض آرٹس کے تمام مضامین ایک ماہر استاد کی طرح پڑھاتے ہیں ۔ اس کے علاوہ وہ سماجی کاموں میں بھی ہمیشہ مصروف نظر آتے ہیں ۔ انھیں ۱۹۵۸ء میں وارث پورہ ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کامٹی

کا سکریٹری مقرر کیا گیا تھا۔ یہ منصب آج بھی اُنھی کے پاس ہے۔ وہ سوسائٹی کی اعزازی طور پر جو خدمت کر رہے ہیں، اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔

اُن کی شاعری کا آغاز ۱۹۳۲ء میں طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ ان وقتوں میں انھیں موسیقی سے فطری لگاؤ ہو گیا تھا اور اسی نے ان کے دل میں شعر گوئی کے جذبات بھی پیدا کیے۔ ادبی کتابوں کے گہرے مطالعے سے ان کی شاعری پر نکھار آیا۔ خصوصاً غالب اور اقبال کا کلام انھیں بہت پسند تھا۔ بعد کو فیض احمد فیض کی شاعری اور کرشن چندر کے افسانوں سے بے حد متاثر ہوئے۔ پھر نگار بھی پابندی سے پڑھتے تھے۔ ان تمام چیزوں نے مل کر ان کے ذہن و فکر میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور وہ کامٹی کی شعری روش سے ہٹ کر ایک نئی راہ پر چلنے لگے اور اپنے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کی۔ بعد کو دیگر شعرا نے بھی اسی روش کو اختیار کرنا شروع کیا۔ سوز کی شاعری اس لحاظ سے کامٹی کی ادبی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔

ان کے کلام میں گہرائی و گیرائی، جوش و جذبات اور تاثرات ہیں۔ بے تکلفی، اصلیت اور سادگی پائی جاتی ہے۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلے یا کسی نفسیاتی کیفیت کو بڑی خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ اُن کا ذہن ماحول اور زندگی سے بہت متاثر نظر آتا ہے۔ حسن و عشق کے مشاہدات جگہ جگہ دکھائی دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں حزن و یاسیت بہت نمایاں ہو گئی ہے جو غالباً عشقِ مجازی میں اُن کی بری طرح ناکامی کا نتیجہ ہے۔

مختلف اصناف میں ان کا وافر کلام ان کے پاس موجود ہے۔ اب انتخاب پیش کرتا ہوں۔ پہلے غزلوں کے چند شعر دیکھیے:

گلوں سے رات کی کچھ بات کہہ رہی تھی مگر ۔۔۔ جب آفتاب نے ٹوکا تو اُڑ گئی شبنم

یہاں چراغ تلے مستقل اندھیرا ہے ۔۔۔ یہ کس کی لو میں جلے جا رہے ہیں پروانے

سوز مجرم ہوں اس محبت کا ۔۔۔ جس کی کوئی سزا نہیں ہوتی

نظر نظر سے ملی تھی کہ بے اڑی دُنیا ۔۔۔ ذرا سی بات کے پھیلے ہوئے ہیں افسانے

ملے راہِ محبت میں نہ کوئی ہم سفر مجھ کو ۔۔۔ تمہاری یاد ہی آتی رہے ہر گام پر مجھ کو

بازو میں ایک پر نہیں لیکن زہے نصیب
صیاد کی نگاہ میں بے پر نہیں ہوں میں

قدم انداز ہو مایوس نہ بیٹھ
کارواں ڈھونڈ غباروں سے نہ کھیل

چمن اپنا چمن کے پھول اپنے ہیں کلی اپنی
مگر پھر بھی خزاں بردوش ہے زندگی اپنی

فریبِ رنگ و بو دے کر کوئی کیا لوٹتا ہم کو
حقیقت میں شریکِ راہزن تھی سادگی اپنی

اٹھ عزم کی آنکھوں سے ذرا دیکھ اے راہی
ہر نقشِ قدم پر تری منزل کا نشاں ہے

سنہرے جیل میں انساں کی کھال پہنچاؤ
کہ سڑ رہی ہیں وہاں تھیلیاں خزانے کی

عمل کیواسطے لازم ہے پختہ کاریِ ہمت
کہ ہلکے رنگ سے اکثر بگڑ جاتی ہیں تصویریں

سمجھ میں خاک آئیگی کشاکش دورِ حاضر کی
حدودِ عقل سے باہر ہیں ان خوابوں کی تعبیریں

ابھی صبحِ زندگی ہے مرے آفتاب آجا
کہیں شام ہوتے ہوتے مرا دل نہ ڈوب جائے

داستانِ عشق کا ہر لفظ ہے شعلہ بدوش
جس کو سن کر نیند آجائے وہ افسانہ کہاں

دل کی دھڑکن سمجھ ہی سکتی ہے
جو اشارا تری نگاہ میں ہے

جب اپنے ہاتھ سے ہی اہتمام گلشن کا
نسیمِ صبح ترا انتظار کون کرے

ڈھونڈتی ہے جو زندگی آرام
زندگی بھر اداس رہتی ہے

ہوس کے پتنگوں سے محفل بھری ہے
کہاں ہم چراغِ محبت جلائیں

جو کھٹکتا ہے سب کی آنکھوں میں
گل کے پہلو میں مسکراتا ہے

سفینہ دل کا موجِ آرزو کو سونپنے والے
کہیں ساحل نہ آجائے سمندر کی روانی پر

گلشنِ زیست کا وہ خطۂ بے آب ہوں میں
فصلِ گل آتے ہی ویرانہ سا ہو جاتا ہوں

سو بار کھا چکا ہوں فریبِ نگاہِ ناز
پھر بھی اسی کی چاہ کیے جا رہا ہوں میں

شمعِ محفل خود جلن اپنی مٹا سکتی نہیں
خواہشِ تسکیں لیے آیا ہے پروانہ کہاں

جان لیتا ہے زمانہ تم کو میرے نام سے
میری رسوائی کے پردے میں تمہارا نام ہے

فضا آنسو بہاتی ہے مآلِ زندگانی پر
چمن میں پھول کے رخسار پر شبنم نہیں ہوتی

اسیرِ رنگِ چمن کا خیال ہے ورنہ
لگا دوں آگ گلستاں میں وہ بہار ہوں میں

سمٹ آتی ہے اک دن سوز آنسو بن کے آنکھوں میں
زباں پر جو حدیثِ آرزو لائی نہیں جاتی

ہم اگر نہیں ہوتے تجھ کو روح دیتا کون
موت تو نے دنیا میں ہم سے زندگی پائی

نظم "آج میں بہت خوش ہوں" کے چند بند دیکھیے:

آج میں بہت خوش ہوں
تو بھی گائے جا بلبل
زندگی کے نغموں کو اب سنائے جا بلبل
آج میں بہت خوش ہوں

میرے مہرِ زریں سے
مل گئیں مری نظریں، آج چشمِ رنگیں سے
آج میں بہت خوش ہوں

روح میری شاداں ہے
بربطِ محبت پر، زندگی غزلخواں ہے
آج میں بہت خوش ہوں

تیرے دل میں پیار آیا
اپنی زندگی کا اب، مجھ کو اعتبار آیا
آج میں بہت خوش ہوں

آ مری خوشی لے لے
تیرا دل اگر چاہے، میری زندگی لے لے

جنگِ آزادی کے زمانے میں سوز نے انتباہ کے عنوان سے ایک انقلابی نظم کہی تھی، اس کے چند بند دیکھیے:

مادرِ ہند ہشیار ہو جا، انقلاب آ رہا ہے
اب مصیبت کی گھڑیاں نہ ہوں گی
غم کے آنسو کی لڑیاں نہ ہوں گی

یہ غلامی کی کڑیاں نہ ہوں گی   انقلاب آرہا ہے
جنگ کا دیوتا ہنس رہا ہے
گوشہ گوشہ جہنم بنا ہے
ہر مکاں مورچہ بن گیا ہے   انقلاب آرہا ہے
اب ہوائی جہازوں کا لشکر
یوں فضا میں لگائیگا چکر
صبح کے وقت جیسے کبوتر   انقلاب آرہا ہے
موت آئیگی منہہ اپنا کھولے
اس طرح برسیں گے بم کے گولے
جیسے سرما کے موسم میں اولے   انقلاب آرہا ہے
لاش کا فرش ہوگا زمیں پر
کچھ مریں گے فضاؤں سے گر کر
لاکھوں ڈوبیں گے پانی کے اندر   انقلاب آرہا ہے
دیکھ سرمایہ داروں سے بچنا
خود غرض عہدہ داروں سے بچنا
قوم کے ٹھیکہ داروں سے بچنا   انقلاب آرہا ہے

درج ذیل نظم "میرے نغمے" قاضی نذرالاسلام کی بنگالی نظم کا ترجمہ ہے ٤

مشقت کے لیے جو ہاتھ کو پتھر بناتے ہیں
بیاباں کی جگہ پھولا پھلا گلشن بساتے ہیں
پسینے کے عوض ایثار میں جو خوں نہاتے ہیں
میں اُن کے گیت گاتا ہوں، میں ان کے گیت گاتا ہوں
جنھیں بیوہ کی آہِ سرد کا احساس ہوتا ہے
یتیموں کی نگاہِ زرد کا احساس ہوتا ہے

جنھیں انسان کے دکھ درد کا احساس ہوتا ہے

میں اُن کے گیت گاتا ہوں، میں اُن کے گیت گاتا ہوں

جو آزادی کی خاطر جان کی پروا نہیں کرتے
کسی قیمت وطن کی آبرو بیچا نہیں کرتے
مصیبت سر پہ آپڑتی ہے تو رویا نہیں کرتے

میں اُن کے گیت گاتا ہوں، میں اُن کے گیت گاتا ہوں

جنھیں کم ظرف دنیا بد دعائیں دیتی رہتی ہے
زبانِ بوالہوس بے ساختہ اوباش کہتی ہے
مگر تاہم طبیعت جن کی اپنی رَو میں بہتی ہے

میں اُن کے گیت گاتا ہوں، میں اُن کے گیت گاتا ہوں

بے بی ہائیڈروجن بم کے متعلق ان کی نظم "بچہ" ملاحظہ ہو:

عقل کی سیج پہ لیٹے ہوئے تنہائی میں
کیمیا باز کو جدت کی تمنا جو ہوئی
برق وش بازو سمیٹے ہوئے طاقت کی پری
جھوم کر آ گئی آغوشِ تمنائی میں
ہر ادا مائلِ جذبات ہوئی دونوں کی
جس گھڑی وصل کے افسانے کی تکمیل ہوئی
تجربہ گاہ میں اک بچے کی تشکیل ہوئی
بار ور خوب ملاقات ہوئی دونوں کی
یہ وہ بچہ ہے کہ تہہ خانوں میں پلتا ہے ابھی
آزمائش کے لیے جاتا ہے طیاروں میں
غیر آباد جزیروں کے سمن زاروں میں
کود کر جوہرِ تخریب اگلتا ہے ابھی
یہ وہ بچہ ہے کہ مسموم فضا کر دیگا
جنگی طیاروں میں اُڑتا ہوا ہر شام و سحر
ملک الموت کو آرام نہ دیگا پل بھر
سانس لیتی ہوئی ہر شے کو فنا کر دیگا
ہے ابھی وقت بدل سکتا ہے بچے کا خمیر
نقش بر آب بناتے ہوئے تخریبی صفات
اس کی بنیاد پہ ہو سکتی ہے تعمیرِ حیات
مجتہد جس کے لیے آج ہے انساں کا ضمیر

اب چند قطعات دیکھیے:

یہ زمانہ ہے خوں فشانی کا
کوئی پیاسا نہیں ہے پانی کا
سوز نامہرباں نہیں دنیا
دوسرا رُخ ہے مہربانی کا

گل و شبنم کے تماشائی بتا
کیا تجھے یہ بھی خبر ہوتی ہے
کتنی آنکھوں میں ہیں ہنستے آنسو
کتنے ہونٹوں پہ ہنسی روتی ہے

حُسن کو خواب سے جگاتا ہوں
ہوش میں عشق کو بھی لاتا ہوں
سوزِ سازِ جگر کے تاروں پر
نغمۂ زندگی سُناتا ہوں

اجل کی نیند سلا دے کہیں نہ دل کی دکان
ہوس کی سیج پہ بے نیند لیٹنے والے
قیام حسن کہاں ہے، کہاں مقامِ شباب
گلوں سے پوچھ بہاریں سمیٹنے والے

ناظرؔ ــــــ محمد عثمان

ناظرؔ ۱۹۱۹ء میں کامٹی میں پیدا ہوئے ۔ اُن کے دادا کا نام منشی عبدالغفور اور والد کا عبدالرؤف تھا ۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم گورنمنٹ پرائمری اسکول کامٹی میں پائی ۔ آٹھویں درجے کا امتحان گورنمنٹ اے وی ایم اسکول کامٹی سے پاس کیا اور تمام طلبہ میں اوّل آنے کی وجہ سے سلور مڈل حاصل کیا ۔ اب ثانوی تعلیم کے لیے انجمن ہائی اسکول ناگپور میں داخل ہوئے ۔ یہاں سے ۱۹۳۸ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا ۔ انھیں میٹرک میں اردو، فارسی اور عربی میں امتیازی نمبر ملے تھے ۔ حُسنِ اتفاق سے ۱۹۴۰ء میں نائب تحصیلدار آفس، ناگپور میں کلرک کی حیثیت سے اُن کا تقرر ہو گیا تھا ۔ یہاں پندرہ سال خدمت انجام دی ۔ لیکن جب اُن کا تبادلہ چاندہ کر دیا گیا تو مستعفی ہو گئے ۔ اس کے بعد ربانی ہائی اسکول کامٹی میں دو سال درس و تدریس کے فرائض انجام دیے ۔ بقیہ زندگی آبائی پیشے بنکری

سے جسم و جان کو یکجا رکھنے کا ساز و سامان مہیا کرتے رہے۔ انھوں نے ۶ ستمبر ۱۹۷۵ء کو رحلت فرمائی۔ آخری آرام گاہ مسلم قبرستان کامٹی میں ہے۔

شعر گوئی کا آغاز طالب علمی کے زمانے میں ہوا۔ غزلوں کے علاوہ کافی تعداد میں نظمیں بھی کہی تھیں، لیکن افسوس کہ ان کا شعری سرمایہ محفوظ نہیں رہ سکا۔

جناب محمد ظہیر وارثی نے دو نظمیں مرحمت کی ہیں۔ پہلی نظم "طلبہ سے خطاب" کے چند بند دیکھیے:

مسکراتی ہوئی کلیوں کی طرح شاد ہو تم قیدِ غم، بندشِ آلام سے آزاد ہو تم
قصرِ تعلیم کی آغوش میں آباد ہو تم ناشناسائے جفائے ستم ایجاد ہو تم
تم کو معلوم نہیں قوم کی الجھن کیا ہے
کاوشِ برق ہے کیا، فکرِ نشیمن کیا ہے

برق چمکے گی تمہیں خوف دلانے کے لیے سنسنائے گی ہوا شور مچانے کے لیے
وحشتیں آئینگی دیوانہ بنانے کے لیے تھرتھرائے گی زمیں ہوش اڑانے کے لیے
ایسے ہنگام میں تم ہوش پہ قابو رکھنا
عزم سے بادِ مخالف کو موافق کرنا

آج انسان کا انسان بنا ہے دشمن قتل، سفاکی و غارت یہ نہیں کچھ قدغن
شور و شر، پھوٹ، حسد، بغض و عداوت، ان بن ایسے ٹوٹے ہیں کہ جڑتے نہیں دل کے بندھن
ہے توقع کہ اخوت کا سبق سیکھو گے
مہر و اخلاص و محبت کا سبق سیکھو گے

دور بیں آنکھ سے نظارۂ دنیا دیکھو غور سے اہلِ زمانہ کی روش کو پرکھو
انقلابات کے اسباب کو سوچو سمجھو مثلِ خورشید چمکنے کی تمنا رکھو
دل میں پیدا تو کرو وسعیِ عمل کی جرأت
خود بخود ہوگی قدم بوس فلک کی رفعت

پھول ہنستے ہیں تو گلشن میں بہار آتی ہے — خاک بھی سبزۂ نازک سے سنور جاتی ہے
کیاری کیاری صبائے ناز سے اٹھلاتی ہے — نکہتِ گل، خس و خاشاک کو مہکاتی ہے

تم بھی اس طرح سے ہنسنا کہ بہار آجائے
یہ چہرۂ قوم پہ کندن سا نکھار آجائے

دوسری نظم کا عنوان "نوجوان طلبہ سے خطاب" ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجیے:

نیا دل، نیا خون ہے، نوجواں ہو — وطن کے چمن میں گلِ شادماں ہو
دکھاؤ گے تم انقلابوں کے طوفاں — ابھی گرچہ ہلکی سی موجِ رواں ہو
جسے عہدِ آئندہ افشا کرے گا — دلِ حال کا تم وہ رازِ نہاں ہو
نفاق و عداوت سے پہلو بچانا — خلوص و محبت کا تم ارمغاں ہو
بتاؤ گے تم آنے والوں کو رستہ — سرِ راہ منزل ابھرتا نشاں ہو

حقیقت کے سانچے میں ڈھلنا ہے تم کو
ابھی تو تخیل ہو، وہم و گماں ہو

یہ دو شعر طورِ رخشاں (مرتبہ طرفہ قریشی)، ص: ۷۲ پر درج ہیں:

بے ترے سیرِ گلستاں کا مزہ کچھ بھی نہیں — یہ بہار اور یہ رنگین فضا کچھ بھی نہیں
آنکھ خورشید کی روشن ہے ترے جلوے سے — ورنہ یہ حلقۂ تیراں کے سوا کچھ بھی نہیں

بیڈھب ــــــــــ محمد شبلی

اگرچہ اصلی نام محمد شبلی ہے، لیکن مشہور محمد صدیق اختر بیڈھب کے نام سے ہوئے۔ مولانا محمد عمر انصاری اطہر کے حقیقی بھتیجے ہیں۔ ان کے والد عبدالقدوس ۳ نومبر ۱۹۲۷ء کو فوت ہوئے۔ بیڈھب اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہیں۔

یکم مارچ ۱۹۲۰ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسہ سراج المومنین کامٹی میں پائی۔ اس کے بعد ۱۹۳۱ء میں گورنمنٹ اے وی ایم اسکول، کامٹی میں داخل لیا۔ یہاں سے مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ ابھی او دار ہائی اسکول کامٹی میں نویں جماعت

میں زیر تعلیم تھے کہ مالی پریشانیوں سے مجبور ہو کر اسکول چھوڑ دیا ۔ چونکہ ان کے چچا مولانا اطہر ایک اچھے صحافی تھے اور ان کا زیادہ وقت انھی کے ساتھ گزرتا تھا لہٰذا ان کو بھی اس کا چسکا لگ گیا اور اپنی زندگی صحافت کی نذر کردی ۔ وہ مختلف اوقات میں سہ روزہ جمہور کامٹی، الفاروق کامٹی، خلافت بمبئی، انقلاب بمبئی اور الجمیعۃ دہلی کے نامہ نگار رہے ہیں ۔

انھوں نے کامٹی کی ہر ادبی، سیاسی اور سماجی تحریک میں حصہ لیا ہے ۔ شعر ۱۹۴۶ء سے کہہ رہے ہیں ۔ اس میں طرفہ قریشی کے شاگرد ہیں ۔ جس زمانے میں سنجیدہ شعر کہتے تھے تو تخلص اختر تھا لیکن جب طبیعت کی جولانی نے مزاح کی راہ دکھائی تو بیڈھب ہو گئے، مگر کلام میں کبھی کبھی ڈھب کی باتیں کہہ جاتے ہیں :

جو سمجھتی ہے آہ کو نغمہ — ایسی سرکار کا زمانہ ہے
کہیے بیگم سے سادگی چھوڑے — شوخ اطوار کا زمانہ ہے

شیخ جی اور تری بزم کے چکر کاٹیں — مجھ کو آتا ہے نظر دال میں کالا ساقی

نام مٹ جائے نہ دنیا سے وفاداری کا — ہر طرف گرم ہے بازار ریاکاری کا

ایک ہو جائیں گی اب دیر و حرم کی رسمیں — شیخ نے دوستی کر لی ہے بھگت رام کے ساتھ

گیہوں چاول کی کمی ہے کھائیے صاحب جوار — اچھے دن کا خواب دیکھا تھا برے دن آگئے

اقتضائے لذتِ کام و دہن کو کیا کہوں — اب اُسے کھٹوا نہیں مرغِ مسلم چاہیئے

چند قطعات درج کیے جاتے ہیں :

ہچکیاں لینے لگی ہے زندگی — ٹیکس کی بھرمار سے ہم دب گئے
اس پہ مہنگائی کا ڈنڈا مستزاد — بس سمجھ لو اب گئے یا جب گئے

بڑھتے بڑھتے اتنی مہنگائی بڑھی — کھاتے کھاتے پیٹ کا غم کھا گیا
خودکشی کر لوں کہ مہنگائی سہوں — آتے آتے ناک میں دم آگیا

انسان اپنے دیش کا آزاد ہے، مگر
نسانیت کا راج ابھی تک نہ ہو سکا

مٹی کے مول ہو گئی بیڈھب یہ زندگی
ستا مگر اناج ابھی تک نہ ہو سکا

راغب : ______ عبدالغفّار

راعین برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے پردادا شیخ بخشی سبزی اور پھلوں کی تجارت کے سلسلے میں کانپور سے کامٹی آئے تھے۔ بعد کو یہیں سکونت اختیار کر لی تھی۔ دادا کا نام حاجی شیخ عیدو تھا۔ جو ایک مذہبی انسان تھے۔ ان کے والد حاجی شیخ باپا میاں بھی (ف ۱۳ مئی ۱۹۴۳ء) بہت مذہبی اور پرہیز گار تھے۔ خدا نے انھیں عزت اور دولت، دونوں سے نوازا تھا۔ وہ زمیندار پیشہ تھے اور اعلا پیمانے پر سبزی اور پھلوں کا بیوپار کرتے تھے۔

راغب ۵ مئی ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے دینیات کی تعلیم کامٹی کے ایک بزرگ میاںجی امام الدین سے حاصل کی۔ انگریزی تعلیم بھی کامٹی میں پائی۔ ربانی ہائی اسکول سے مڈل کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد ہی سنترے کی تجارت میں مصروف ہو گئے۔ والد کے انتقال کے بعد باغیچہ اور کاروبار ورثے میں ملا تھا۔ اس لیے زندگی بے فکری اور بے حد آرام و آسائش میں گزر رہی ہے۔ طالبعلمی کے زمانے میں انھیں ڈراموں سے گہری دلچسپی ہو گئی تھی۔ اسی شوق نے انھیں شعر گوئی کی طرف مائل کیا۔ وہ حافظ الور کے ممتاز شاگردوں میں ہیں۔ شعر بہت ہی غور و فکر کے بعد کہتے ہیں۔ کلام میں پختگی، سلاست اور برجستگی ہے۔ جذبات کی عکاسی میں کمال حاصل ہے:

نہ اختیار رہے ان پر، نہ موت پر راغب
جہانِ شوق میں اپنی بھی زندگی کیا ہے

نہ آپ آئے، نہ آنے کی کچھ خبر آئی
غریب یاد کو آنا تھا عمر بھر آئی

ہر ایک موج نے جھنجھلا کے سر کو پیٹ لیا
ہماری ناؤ جو گرداب سے ابھر آئی

ہمارا کون تھا فرقت میں پوچھنے والا
تمھاری یاد کے صدقے کہ بار بار آئی

یہ سنگ باریاں ارباب ہوش کیا جانیں — جنوں کو پیش کیے جا رہے ہیں نذرانے

کیا مزہ ہو کہ تجھی پر مرا پہرہ ہو جائے — کاش بن جاؤں میں آنکھیں ترے دربانوں کی

میں نے ہر تلخ حقیقت سے ملا کر آنکھیں — عمر بھر گردشِ ایام سے باتیں کی ہیں

آئینہ وار آگے بڑھیں میری حسرتیں — وہ بن سنور کے آئے ہیں اور آئینہ نہیں

تو شرحِ اشکِ سوزِ محبت نہ کر ابھی — میں کر رہا ہوں قطرے کو دریا ترے لئے

زباں ہے وہ زباں پاسِ حیا ملحوظ ہے جس کو — نظر ہے وہ نظر جو بات کرتی ہے اشاروں میں

یہ تم نے آتے ہی کیوں مجھ سے خود کو چھین لیا — تمہیں سے تھا میں تصور میں ہم کنار ابھی

یہ سمجھ لیجیئے پھر توڑیے آئینۂ دل — آئینہ ٹوٹ کے سو شکل بنا دیتا ہے

کچھ تو ہے حسن کی فطرت میں تلوّن راغب — اور کچھ اپنا جنوں بات بڑھا دیتا ہے

انیس آغائی — محمد انیس الدین

عبدالمجید آغا کے بیٹے ہیں۔ ریاض الرحمٰن تاریخی نام ہے جس سے ۱۳۴۰ھ برآمد ہوتا ہے۔ انھوں نے مدرسہ سراج المومنین کامٹی سے دینیات کی تعلیم حاصل کی۔ وہیں قرآن مجید کا ناظرہ بھی ختم کیا۔ بعد کو گورنمنٹ اردو پرائمری اسکول کامٹی سے چوتھی جماعت کا امتحان پاس کر کے ربانی ہائی اسکول کامٹی میں داخلہ لیا۔ لیکن مالی بدحالی کی وجہ سے درجہ ہشتم سے اسکول چھوڑ دینا پڑا۔

ان کی شاعری صرف تاریخ گوئی تک محدود ہے۔ یہ فن انھیں والد سے ورثے میں ملا ہے۔ انیس حالات کی مناسبت سے تاریخی قطعات کہتے ہیں: ان کے نکالے ہوئے تاریخی مادّے سلیس اور صاف ستھرے ہوتے ہیں:

قطعہ تاریخ وفات مفتی کفایت اللہ صاحبؒ:

چل گئی کیسی ہوائے سنِ باغ — زندگانی کا چھلک اٹھا ایاغ

قطعۂ تاریخ ہے یہ بے مثال — ہو گیا گل آہ دہلی کا چراغ

قطعہ تاریخ وفات سید سُلیمان ندوی صاحبؒ :

ہم ابھی بھولے نہیں تھے مفتیِ اعظم کا غم
آہ پھر مُرجھا گیا علم و ادب کا سبز باغ
کہدو اب سید سُلیمان کی بھی تاریخِ وفات
آج یہ بھی بجھ گیا یک دین کا روشن چراغ

۱۹۵۳ء

قطعہ تاریخ وفات علامہ عبداللہ یوسف علی :

ایسے عالم کی جُدائی سے نہ کیوں
ہر مسلماں خون کے آنسو بہائے
مصرعِ تاریخ یوں کہدو انیس
غم ہوا یوسف علی کا ہائے ہائے

۱۳۷۳ھ

قطعہ تاریخ وفات مولانا حسین احمد مدنیؒ :

جانبِ فردوس رخصت ہو گئے شیخ العرب
عالمِ اسلام میں اک شورِ محشر ہے بپا
ہو گئی تاریک علم و فضل کی دنیا انیس
آہ جس دم وہ درخشاں کستارہ چھپ گیا

۱۹۵۷ء

قطعہ تاریخ وفات مولانا ابوالکلام آزادؒ :

چھا گئی غم کی گھٹا جاتا رہا صبر و قرار
راجن و نہرو، کرشن و پنت بھی ہیں اشکبار
کم ہیں جتنا بھی کریں ہم ان کا ماتم اے انیس
چل بسے اب حضرتِ آزاد، وہ عالی وقار

۱۹۵۸ء

کیفی اسمٰعیلی : ——— خلیل الرحمٰن

ان کے بزرگوں کا وطن ضلع اعظم گڑھ کا مردم خیز علاقہ مئو ہے ۔ یہیں سے ان کے پردادا شیخ کتوا رو ۱۸۵۷ء کے بعد کامٹی آئے ۔ دادا کا نام نور محمد (ف ۱۹۳۲ء) اور والد کا محمد اسمٰعیل تھا ۔ اس خاندان کے بیشتر لوگ بڑے مذہبی ہیں ۔ محمد اسمٰعیل مدرسہ غنچۂ اسلام کامٹی میں عربی کے مدرّس اور مسجد اسمٰعیل پورہ کامٹی کے امام تھے ۔ انھوں نے ان خدمات کا کبھی کوئی معاوضہ قبول نہیں کیا ۔ سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے ۔ غرض

اس علاقے کی بڑی معزز اور ممتاز شخصیت تھے۔ ان کا انتقال ۲ مئی ۱۹۷۱ء کو ہوا۔ ان کے تین بیٹے ہیں: خلیل الرحمٰن (کیفی اسمٰعیلی) محفوظ اکبر اور شمیم احمد۔ کیفی ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد کی نگرانی میں قرآن کریم کا ناظرہ ختم کیا اور انھی سے اردو فارسی کی چند کتابیں پڑھیں۔ ابھی سترہ برس کے تھے کہ شعر گوئی کا چسکا لگ گیا اور ذاتی مشق و مطالعے سے اس میں کامیابی حاصل کی۔ کلام پر اب تک کسی سے اصلاح نہیں لی ہے۔ اصنافِ سخن میں غزل، نظم اور قطعہ کافی مقدار میں کہا ہے۔ غزلوں کے چند شعر:

وہ تھے تو خار زار بھی گلزار سا لگا
وہ کیا گئے کہ گل بھی مجھے خار سا لگا

پھیلی ہے چاندنی سے مرے گھر میں تیرگی
دل ان کو ڈھونڈتا ہے شبِ ماہتاب میں

مجرم ہو کوئی اور، سزا پائے کوئی اور
انصاف کی یہ کم نگہی یاد رہے گی

روز اخبار میں چھپ کر یہ کہانی آئی
امن بوڑھا ہوا، فتنوں پہ جوانی آئی

تم نہیں ہو تو تمہاری یاد ہی کے ساتھ ساتھ
کٹ رہے ہیں دن بہر صورت کسی کے ساتھ ساتھ

رہے گرمِ عمل جو لوگ تعمیرِ گلستاں میں
انھی کا آشیاں پھونکا گیا فصلِ بہاراں میں

بڑھی جاتی ہے حد سے پیکرِ نازک کی عریانی
کہیں ایسا نہ ہو تہذیب پر اس کا اثر آئے

کم ز دریہ اک ظلم ہی ہوتا نہیں کیفی
اس دور میں مظلوم کو ملتی ہے سزا بھی

مری خوشی کی کوئی انتہا نہیں اے دوست
کہ غم سے کھیل رہا ہوں تری رضا کے لیے

ہوں مشتِ خاک لیکن جب اڑا ہوں
زمانے کی فضا پر چھا گیا ہوں

نظر آئے گی اُن کی شکل مجھ میں
مجھے دیکھو میں ان کا آئینہ ہوں

عزیز قدوسی ؛ ــــــ عبدالعزیز

ان کے پردادا مبارک، مئو (ضلع اعظم گڑھ) کے رہنے والے تھے، ان کے دادا برکت اللہ انیسویں صدی کے اواخر میں جبلپور سے تلاشِ معاش میں کامٹی آئے۔

اور یہیں آباد ہو گئے۔ والد کا نام عبدالقدوس ہے۔

عزیز قدوسی ۹ جولائی ۱۹۲۵ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مدرسۃ المسلمین کامٹی میں حاصل کی۔ اس کے بعد چند مجبوریوں کی وجہ سے وہ کسی اسکول میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ البتہ بعد کو حافظ محمد نذیر (ف ۱۹۵۲ء) سے فارسی پڑھی اور اس میں مکمل عبور حاصل کیا۔ انھی کی رہنمائی میں شاعری کی منزلیں بھی طے کی ہیں۔ انھیں نظم و نثر پر یکساں قدرت حاصل ہے۔ تاریخ گوئی میں ید طولا رکھتے ہیں۔ اس فن میں ہند و پاک میں نمایاں مقام حاصل ہے۔ اچھے طبیب ہیں اور طب کا پیشہ ہی ان کے معاش کا مستقل سہارا ہے۔ نمونۂ کلام :

چہرے سے نقاب ان کو اٹھانے میں ڈر کیا
ٹھہرے گی چمکتے ہوئے سورج پہ نظر کیا

یارانِ راہِ شوق چلے آئیں بے خطر
کانٹوں کو اپنے ساتھ لیے جا رہا ہوں میں

میں سمجھتا ہوں مری دیوانگی کامل نہیں
مجھ کو پتھر مارنے والوں میں تم شامل نہیں

کوئی رفیق نہیں ہے تو پھر رقیب سہی
کسی کے کام تو آجائے زندگی میری

جو ترے نام سے پھینکے گئے مجھ پر پتھر
میرے نزدیک ہیں وہ پھول سے بڑھ کر پتھر

آ آ کے پلٹ جاتی ہے بالیں سے اجل کیوں
شاید کوئی مصروفِ دعا میرے لیے ہے

سچ ہے یہ بات کہ ہوتی ہے محبت اندھی
شمع کی لو بھی نظر آئی نہ پروانے کو

ہم نے مانا کہ نہ ہوگا کوئی
دشت میں امن و اماں تو ہوگا

جس کی تلاش تھی، نہ وہی نقشِ پا ملا
یوں تو قدم قدم پہ نقوشِ قدم ملے

حسن کو شوقِ نمائش نے کیا جب بیتاب
بے حجابی کے لیے بن گیا پردہ انساں

اثر کرمی : —— عبدالباری

منشی محمد اسحٰق، اسحٰق کے بیٹے ہیں۔ ۱۹۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ مدرسۃ المسلمین کامٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کاروبار میں مصروف ہو گئے۔ پھر

انھیں باقاعدہ تحصیلِ علم کا موقع نہ مل سکا۔ البتہ نجی طور سے اردو فارسی کی کچھ کتابیں پڑھیں اور ان زبانوں میں اچھی استعداد پیدا کر لی۔ شاعری ورثے میں ملی ہے۔ مشورۂ سخن عزیز قدوسی اور شاطر حکیمی سے کیا ہے۔

غزل کے شاعر ہیں۔ کلام میں گہرائی و گیرائی ملتی ہے۔ غور و فکر کے ساتھ شعر کہتے ہیں۔ شاعری کے جدید رجحانات سے بھی متاثر ہیں۔

چند اشعار دیکھیے :

کتنے خوشیوں کے سفینے ہو گئے ہیں لاپتہ
غم وہ بحرِ بیکراں ہے جس کا اندازہ نہیں

کسی کا اور بھی چہرہ ہے شاید میرے چہرے پر
نہ جانے آئینہ تکتا ہے کیوں مجھ کو تحیّر سے

یہ عالم ہے مرا سایہ بھی خود بیزار ہے مجھ سے
لرز جاتا ہوں میں تیری جدائی کے تصور سے

آواز دے کے اُس کو جگاتا میں کس طرح
سویا تھا کچھ وہ ایسے کہ بیدار سا لگا

میں کر رہا تھا اُن سے اثر بات پیار کی
کوئی کھڑا ہوا پسِ دیوار سا لگا

کیا خبر تجھ کو کہ تیری بزم میں
آئے تھے ہم کتنے ارمانوں کے ساتھ

خوشی آئی ہے استقبال کرنے
یہ دل معراجِ غم کی پا گیا کیا

ارادہ کر رہا تھا میکشی سے توبہ کرنے کا
سرِ میخانہ گھر کر بادلوں کے دل کے دل آئے

کسی نے حالِ دل پوچھا جو مجھ سے مہرباں ہو کر
تو میری آنکھ سے بیساختہ آنسو نکل آئے

بے قصد بڑھا ہے جو گریباں کی طرف ہاتھ
وحشت کی یہ معراج ہوا ایسا تو نہیں ہے

جلیل عرشی : ــــــــــ عبد الجلیل

اعظم گڑھ کی تحصیل موڑ میں ادری نام کا ایک قصبہ ہے۔ وہیں سے اُن کے پر دادا حاجی عبد الرحمٰن فکرِ معاش میں کامٹی آئے تھے۔ بعد کو انھوں نے بسلسلۂ تجارت کھولاپور (ضلع امراؤتی) میں سکونت اختیار کی۔ وہیں انتقال ہوا۔ ان کے تین بیٹے تھے : حاجی عبد اللہ، حاجی محمد اور حاجی عباد اللہ۔

یہی حاجی عبد اللہ، جلیل عرشی کے جدِ امجد ہیں۔

ان کے والد حافظ دین محمد اعلا پیمانے پر بیڑی سازی کا کاروبار کرتے تھے۔ یہ فرم "ہاکی بیڑی کامٹی" کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔ حاجی دین محمد کو قدرت نے فیاضی اور سخاوت کی دولت بھی دی تھی۔ سماجی اور تعلیمی لحاظ سے اس علاقے میں ان کی بے انتہا خدمات ہیں۔ کم و بیش کامٹی کے ہر علمی، ادبی اور مذہبی ادارے کی انھوں نے دل کھول کر مالی اعانت کی ہے، اسی لیے سماج میں احترام و عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ انھیں گورنمنٹ نے فرسٹ کلاس آنریری مجسٹریٹ مقرر کیا تھا۔ انھوں نے ۱۳ فروری ۱۹۶۲ء کو وفات پائی۔ اپنے پیچھے جسمانی یادگار چار لڑکے چھوڑے: عبدالرشید صدیقی (ف ۳ دسمبر ۱۹۷۲ء)، حاجی عبداللطیف انصاری (اس وقت کراچی میں مقیم ہیں)، عبدالجلیل (جلیل عرشی) اور عبدالحفیظ۔

جلیل عرشی فروری ۱۹۲۶ء میں کھولاپور میں پیدا ہوئے۔ وہ بچپن میں اپنے والد کے ہمراہ کامٹی آئے۔ انھوں نے ربانی ہائی اسکول سے ۱۹۴۴ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد مارس کالج ناگپور (ناگپور مہاودیالیہ ناگپور) سے ایف۔ اے اور انٹر میجیٹ کے امتحانات پاس کیے۔ ابھی بی اے کے سالِ اوّل میں تھے کہ ملک دو حصّوں میں تقسیم ہوگیا اور اسی کے ساتھ کشت و خون کا بازار گرم ہوا۔ اس سے لوگوں میں بدحواسی پھیل گئی اور ہجرت کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوا۔ چنانچہ جلیل بھی تقسیم ملک کے بعد اپنے خاندان کے ہمراہ حیدرآباد چلے گئے۔ اس طرح ان کی تعلیم ادھوری رہ گئی اور پھر اس کی تکمیل کا انھیں موقع نہ مل سکا۔ جب حالات بہتر ہوگئے تو کامٹی لوٹ آئے اور کاروبار میں مصروف ہوگئے۔ لیکن کاروباری مصروفیت کے باوجود وہ سماجی، ادبی اور تعلیمی خدمات سے کبھی غافل نہیں رہے۔ انھوں نے خیال اور الفاروق کو مالی تعاون دیا، علمی اور تعلیمی اداروں کی سرپرستی کی اور اساتذہ کے لیے بیت المال

قائم کیا۔ ربانی ہائی اسکول کی نئی عمارت کا سنگِ بنیاد انھی کے ہاتھوں رکھا گیا تھا۔ وہ میونسپل کمیٹی کامٹی کے نائب صدر بھی رہ چکے ہیں اور کامٹی میں ہونے والے متعدد ادبی جلسوں اور مشاعروں کی صدارت بھی کی ہے۔

انھوں نے ۱۹۴۳ء میں شعر کہنا شروع کیا اور اس پر حافظ انور سے اصلاح لی۔ وہ اپنے استاد کی دل کی گہرائیوں سے عزت کرتے تھے، اس کا ثبوت اس مقدمے سے فراہم ہوتا ہے، جو انور کے مجموعۂ کلام تجلیاتِ انور میں شامل ہے۔ انھیں نثر نگاری سے بھی مزاولت ہے۔ چند مضامین کے علاوہ نثر میں ان کی ایک کتاب "ستارے اور سیارے" چھپ چکی ہے۔ اس میں انھوں نے جدید و قدیم معلومات کی روشنی میں کائنات کی سیر کرائی ہے۔ یہ کتاب، جو ۱۱۲ صفحات پر مشتمل ہے ۱۹۶۲ میں دین دیال پریس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔

ان کے کلام میں پختگی، روایت کی پابندی اور درد و سوز کی فراوانی ہے:

عرشی رہا خزاں میں نہ کچھ لطف میکشی ۔۔۔ خونِ نشاط کر دیا، خونِ بہار نے

پھولوں سے پہلے داغ مرے دل کے کھل گئے ۔۔۔ یارب نہ ہو کسی کو تمنا بہار کی

دل پر چلا ہے کس کا محبت میں اختیار ۔۔۔ اچھی کہی یہ آپ نے بھی اختیار کی

خدا گواہ ترے غم میں تھی یہ مجبوری ۔۔۔ گرے جو آنکھ سے آنسو تو ہم اٹھا نہ سکے

رکو تو ایسے کہ ماحول کی فضا رک جائے ۔۔۔ بڑھو تو ایسے کہ تم کو زمانہ پا نہ سکے

کسی کی یاد میں اے کاش ایسی نیند آئے ۔۔۔ کہ شورِ حشر بھی عرشی ہمیں جگا نہ سکے

ساتھی تھے سب اچھے کہ کسی نے بھی نہ پوچھا ۔۔۔ ہم لُٹ کے چلے آپ کی جب راہ گزر سے

دل کے طالب تھے دے دیا ہم نے ۔۔۔ اب ہیں باتیں ملال کی کیسی

رنج و آلام ہو رخصت تو بلاؤں ان کو ۔۔۔ خانۂ دل میں ابھی بھیڑ ہے مہمانوں کی

بہت لطیف مرے دل میں یاد ہے ان کی ۔۔۔ ہوائے عشق سے کہدو کہ ساز گار رہے

پیار کیوں اس دلِ مخزوں پہ مجھے آتا ہے ۔۔۔ کون در پردہ ہے مسرور تھیں کیا معلوم

افسردگیِ دل کا مداوا نہ ہوسکا
کیا یاد تجھ کو ذکرِ بہاراں کریں گے ہم

جلووں کے ساتھ ساتھ کرم کی بھی ہو نظر
پانی کے دیکھ لینے سے بجھتی نہیں ہے پیاس

کچھ تم سے عرضِ حال کی حاجت نہیں مجھے
تم جانتے ہو کیوں ہے مری زندگی اداس

وہ غم نہیں قبول، دلِ غم پسند کو
یارب وہ غم جو حاصلِ کون و مکاں نہ ہو

اپنوں کے میں نے کھائے ہیں کچھ اس قدر فریب
غیروں سے مجھ کو کوئی شکایت نہیں رہی

ایک مختصر نظم "شرارت" ملاحظہ کیجیے :

عُروسِ حسن سے مسحور کن انگڑائیاں لے کر
چمن کے شوخ غنچوں سے کبھی رعنائیاں لے کر

تبسم رقص کرتا جب ترے ہونٹوں پہ آتا ہے
تمناؤں کو میری چھیڑتا ہے گدگداتا ہے

سُرورِ جانفزا لے کر بہشتِ نوجوانی سے
ادا دلنشیں لے کر کبھی غمزوں کی رانی سے

خمارِ عشق جب نظروں میں تیری مسکراتا ہے
تمناؤں کو میری چھیڑتا ہے گدگداتا ہے

ہزاروں پارۂ سیماب سے بیتابیاں لے کر
شبِ ہجراں کے داماں سے کبھی تاریکیاں لے کر

ترے شانوں پہ جب گیسوئے شب گوں پیچ کھاتا ہے
تمناؤں کو میری چھیڑتا ہے گدگداتا ہے

راہی : ــــــــ عبدالرحمٰن

ان کے دادا کا نام خدا بخش تھا۔ ان کے والد حاجی عبدالرحیم، کامٹی کے ایک نامور بزرگ گزرے ہیں۔ وہ ایک مذہبی انسان تھے اور زہد و تقویٰ میں بلند مقام رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۳۲۷ھ میں مولانا شاہ فضل رحمان گنج مرادآبادی کے خلیفہ، صوفی محمد جان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ بعد کو جب صوفی صاحب نے انھیں اپنا خلیفہ مقرر کر دیا تو متعدد لوگ اُن کے مُرید ہوئے۔ ان کا انتقال ۱۳۸۹ھ میں ہوا۔ تاریخ وفات انیس آغائی نے کہی :

کہہ دو مصرع انیس تاریخی
چل دئے آہ پیرِ خوش اطوار ۱۳۸۹ھ

راہی اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم سراسر دینی اور مذہبی علوم پر مشتمل ہے۔ انھوں نے ان علوم کی تکمیل جامعہ عربیہ اسلامیہ ناگپور سے کرنے کے بعد ۱۹۴۸ء میں ناگپور یونیورسٹی سے مولوی فاضل کی سند حاصل کی۔

شعر، طالبعلمی کے زمانے سے کہہ رہے ہیں۔ کلام پر شاطر حکیمی اور مولانا انور سے اصلاح لی ہے اور ان کی صحبت میں رہ کر شاعری کے فن سے بخوبی واقف ہو گئے ہیں۔ ان کی غزلوں میں پختگی اور بلند خیالی ملتی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

رہ گئے اہلِ خرد کرتے ہی تشریحِ وفا
اہلِ دل، جاں دے کے مفہوم وفا سمجھا گئے

پیش آنے کو ہے کیا کوئی نیا پھر حادثہ
دفعتاً وہ مدتوں کے بعد کیوں یاد آگئے

جبیں پہ شدتِ غم میں بھی بل نہیں پڑتے
مزاجِ گردشِ دوراں سمجھ چکا ہوں میں

جنونِ شوق میں منزل کہاں مقام کہاں
حدودِ فکر سے آگے نکل گیا ہوں میں

مرے وجود سے ہنگامہ ہائے ہستی ہے
بساطِ دہر پہ مانا کہ نقشِ پا ہوں میں

سادگی سر بہ گریباں کہ کہاں رکھے قدم
دام ہر سمت ہے پھیلا ہوا ہشیاری کا

فکر پر خواب کے حالات کا کیا کہیے اثر
خواب سے کم نہیں احساس بھی بیداری کا

کہدو کہ پھیر لے منھ، اب گردشِ زمانہ
میں نے بدل دیا ہے رُخ اپنی زندگی کا

جلا رہا ہوں میں خود کو اس احتیاط کے ساتھ
کہ دُور تک نہ کہیں آگ کی لپٹ جائے

کرم اس میں ترا ہی گردشِ ایام پاتے ہیں
شعورِ میکشی جن کو نہیں وہ جام پاتے ہیں

معلوم ہیں ہمیں بھی قفس کی حقیقتیں
کچھ جان کر ہی ہم بھی تہہ دام آگئے

فریبِ جستجو ہے یہ کہ ہے تکمیلِ نظارہ
نگاہِ شوق جس جانب اٹھی تم ہی نظر آئے

انھی تاریکیوں میں آؤ ہم ڈھونڈیں کرن کوئی
یہ کب تک انتظار آخر کہ شب گزرے سحر آئے

نہ جانے کس قدر راہوں کے پیچ و خم سے گزرے ہیں
کہیں پھر جا کے راہی ہم کو آدابِ سفر آئے

تو نظر اپنی اٹھائے تو کچھ انداز لگے
حادثے کتنے چھپے ہیں تری پلکوں کے قریب

سر پھرے جھک گئے ناحق مری پوجا کے لیے — راہ کا سنگ تھا میں مجھ کو ہٹا دینا تھا
زمانہ جھک تو رہا تھا برائے پابوسی — ہمیں ضمیر کو خود اپنے دے سکے نہ فریب

تابش حلیمی : ——— خورشید احمد

ان کے جدِ اعلا بلاقی، کوپا (ضلع اعظم گڑھ) سے کامٹی آئے تھے۔ دادا کا نام عبدالحلیم تھا۔ وہ حافظِ قرآن تھے اور ادب وسیاست سے دلچسپی رکھتے تھے۔ والد کا نام سراج احمد انصاری تھا۔

تابش حلیمی یکم جنوری ۱۹۲۷ء کو پیدا ہوئے۔ ان کا بچپن تمسر (ضلع بھنڈارا) میں گزرا ہے۔ ابتدائی تعلیم مراٹھی پرائمری اسکول، تمسر میں پائی۔ ۱۹۵۸ء میں میٹرک کا امتحان پرائیوٹ طور پر پاس کیا۔ بعدازاں مارس کالج، ناگپور (ناگپور مہاودیالیہ ناگپور) میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ۱۹۶۲ء میں بی اے کی سند لی۔ اسی یونیورسٹی سے ۱۹۶۶ء میں بی ایڈ اور ۱۹۷۴ء میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی۔

انھوں نے جس سال بی اے کیا، اسی سال مہاتما گاندھی ہائی اسکول باسیم (ضلع آکولہ) میں انھیں مدرسی کی جگہ مل گئی۔ لیکن ۱۹۶۵ء میں اس علاقے میں فرقہ وارانہ فساد پھوٹ پڑا، جس سے متاثر ہو کر استعفی دے دیا اور کامٹی لوٹ آئے۔ ایک سال سری رام ہائی اسکول میں ملازمت کی۔ ۱۹۶۷ء میں انجمن ہائی اسکول، ناگپور میں ان کا تقرر ہوا، اب تک یہیں درس وتدریس کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

انھیں طالب علمی کے زمانے میں موسیقی سے لگاؤ ہو گیا تھا۔ آگے چل کر اس سے اتنی دلچسپی بڑھی کہ بی اے میں ایڈیشنل مضمون کی حیثیت سے اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی۔ اصل میں اسی شوق نے ان کو شاعری کے میدان میں پہنچایا ہے۔ انھوں نے ۱۹۵۰ء سے شعر کہنا شروع کیا۔ اس میں پہلے حافظ انور

سے مشورہ کیا۔ بعد کو نواب غازی سے اصلاح لی۔ اگرچہ طبعی رجحان غزل گوئی کی طرف ہے۔ لیکن رباعیاں، نظمیں اور تاریخی قطعات بھی کہتے ہیں۔ چونکہ ابتدائی اور ثانوی جماعتوں میں مراٹھی ذریعۂ تعلیم تھی، اس لیے اس زبان پر انھیں دسترس حاصل ہوگئی ہے اور اس میں بھی کچھ کلام کہا ہے۔ ان کی شاعری میں جذبات کا جوش اور فکر کی توانائی ہے۔ رباعیوں سے عروضی مہارت اور شاعرانہ پختگی ظاہر ہے۔ نمونۂ کلام :

ظلم ڈھاکر بھی یہ مظلوم نظر آتی ہے ۔۔۔ دل کو تڑپاکے تری یاد تڑپ جاتی ہے
وہ جو کانٹوں سے چھڑاتے ہیں چمن میں دامن ۔۔۔ رُوحِ گل جنبشِ داماں سے کھنچی جاتی ہے
جلوۂ حُسن سے ہوتی نہیں سیراب نظر ۔۔۔ ان سے ملتی ہے مری آنکھ تو بھر آتی ہے

وہ اسی راہ سے گذریں گے یقیناً تابش
رونقِ راہ گزر دیکھ بڑھی جاتی ہے

ملتے ہی نظر مجھ سے آنکھیں تری بھر آئیں ۔۔۔ یوں دادِ وفا دیتے چھلکے ہوئے پیمانے

رعنائیِ خیال کا سامان ہو گیا ۔۔۔ احسان تم نے کر دیا رہ کر حجاب میں

نہ ہو بدگماں حُسن کی خامشی سے ۔۔۔ یہ انداز ہے، احترام محبّت

یادِ ماضی ہی اب زندگی ہے ۔۔۔ کیسے بیتے دنوں کو بُھلائیں

صبحدم کس نے انگڑائیاں لیں ۔۔۔ ہوش میں آرہی ہیں فضائیں

اس کا مرنا بھی ہے صد نازشِ آئینِ حیات ۔۔۔ جس کا ماتم تری زلفوں کو پریشاں کردے

گرے برقِ ناز دل پر مگر اک ذرا سنبھل کر ۔۔۔ تری آنکھ ہی کا سرمہ نہ بنے یہ طور جل کر

تیری بھی تمنائیں پامال اگر ہوتیں ۔۔۔ بہتے ہوئے آنسو میں کچھ خون ملا ہوتا

جَور ہی کی لذت میں محو مجھ کو رہنے دو ۔۔۔ وعدۂ وفا کرنا میرا دل دکھانا ہے

گلِ رنگیں کو سمجھتے جو نزاکت کا حریف ۔۔۔ اپنے رُخ کو نہ کبھی ہاتھ لگانے دیتے

جہاں میں نہ ہو کیوں مری نیک نامی ۔۔۔ ترے نام کے ساتھ نام آرہا ہے
خلوتِ غم میں ہے خوشی کا ہجوم ۔۔۔ تیرا خط آج کھلا ہو جیسے

ہزار نیک سہی پھر بھی کون مانے گا — تو اپنے ماتھے پہ کالا سا اک نشان لگا

ایک نیچرل نظم :

اے کہ ہندوستان تو ہے اک مقدس سرزمیں
جنتِ ارضی کا خطہ تیرا دامانِ حسیں

فطرتِ رنگیں نے چھڑکا ہے فضاؤں میں گلال — وادی و کہسار ہیں اک رنگ و بُو کا حشر زار
بادۂ فصلِ بہاراں ہے ہوا لغزش خرام — ہے یوں ہلکوروں میں گندھر بکا دلکش نکھار

اے کہ ہندوستان تو ہے اک مقدس سرزمیں
جنتِ ارضی کا خطہ تیرا دامانِ حسیں

تیرے جھرنوں کے مدھر سنگیت پر سر گم نثار — قہقہہ زن آبشاروں کا سبک رو دھواں
وادیِ گلپوش کے آغوش میں وہ نغمہ زار — جھومتی ہیں جن کو سن کر لہلہاتی کھیتیاں

اے کہ ہندوستان تو ہے اک مقدس سرزمیں
جنتِ ارضی کا خطہ، تیرا دامانِ حسیں

تیرے دریائے مقدس ہیں ترنم آفریں — ابرِ گوہر بار ہر سُو آسماں پر ہے رواں
نغمگی کا ایک سنگم چشمہ ہائے کوہسار — ایک سیتک ہے سرد لکا موجہائے نغمہ خواں

اے کہ ہندوستان تو ہے اک مقدس سرزمیں
جنتِ ارضی کا خطہ، تیرا دامانِ حسیں

مخملیں فرشِ چمن ہے شبنمستاں درکنار — کیف ساماں ہے فضائے ارغوانی کا سماں
پرتوِ گل سے ہے گلگوں صبحدم یوں سطحِ آب — آب جو میں آتشِ سیال جیسے ہو رواں

اے کہ ہندوستان تو ہے اک مقدس سرزمیں
جنتِ ارضی کا خطہ، تیرا دامانِ حسیں

چند رباعیاں :

اس سے جو کہو بدیس اب ہے جانا — کھاتی نہیں اس فکر میں پہروں کھانا
پوچھو کہ تجھے چاہیے تحفہ کیسا — کہتی ہے مری یاد ہی لیتے آنا

دفتر کا پتا میرا لکھا دیتی ہے
کس سمت ہے انگلی سے بتا دیتی ہے
جب پوچھنے لگتا ہے کوئی نام مرا
وہ شرم سے منھ اپنا چھپا لیتی ہے

کرتا ہوں کبھی جو سخت لہجے میں خطاب
کر دیتی ہے ٹھنڈا وہ مرا جوشِ عتاب
ہو جاتی ہیں کافور جبیں کی شکنیں
ہنس کر دیتی ہے، ترش روئی کا جواب

ہنستے ہوئے آ بیٹھتی ہے میرے پاس
دیتی ہے مزہ اور ہی لہجے کی مٹھاس
ہر رُخ سے مجھے دیکھ کے خوش ہوتی ہے
جب اس کی پسند کا پہنتا ہوں لباس

ہے لحنِ گلو سوز بھی دلکش اک بین
تحسین کے لائق ہے سُروں کی تزئین
ہوتی ہے جو نغمہ ریز مدھم لے میں
گاتے ہوئے رک جاتی ہے سینے کی مشین

مصروف ہو خواہ کتنی ہی گھر میں مگر
وہ دیکھ ہی لیتی ہے مجھے جی بھر کر
میلی سی نظر آتی ہے جب بھی تصویر
کر دیتی ہے صاف آنچل سے گردِ نظر

نیاز انجم : ـــــــ نیاز احمد

عبدالقادر اخگر کے حقیقی نواسے ہیں۔ عباد اللہ ان کے والد کا نام ہے۔ ۱۹۲۷ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اردو پرائمری اسکول کامٹی میں ہوئی۔ عربی فارسی مولانا محمد عمر انصاری اطہر اور منشی نورالحسن صادق سے پڑھی۔ کول مائنز ترودڑی (ضلع بالا گھاٹ) میں فٹر تھے۔ وہیں ۶ دسمبر ۱۹۵۹ء کو ایک ناگہانی حادثے کا شکار ہوئے۔ مسلم قبرستان کامٹی میں آسودۂ خواب ہیں۔ اولاد میں ایک لڑکا (اشفاق انجم) اور تین لڑکیاں ہیں۔
انھوں نے مولانا اطہر کی تحریک پر شعر کہنا شروع کیا اور انھی سے کلام پر اصلاح

بھی لی۔ کچھ شعر دیکھیے :

کس درجہ مکمل ہے ترا حسنِ ستم گر
جس رنگ میں دیکھا تجھے اس رنگ میں پایا

محمد مجھ کو چار کے کاندھوں کا بار ہونا تھا
یہی ہے شرم جو اٹھتا نہیں ہے سر میرا

پیشِ منزل میں نے صحرا کی طرف مڑ کر کہا
یہ تری منزل ہے رہبر اور مری منزل ہے یہ

یہ ذکرِ حور اور مجھ بندۂ وحشت سے کیا کہنا
مسلماں ہی کو دیجے حضرت واعظ یہ سب جھانسے

ہم سے پوچھو کہ قیامت کا گزرنا کیا ہے
ہم نے جھیلی ہے مصیبت شبِ تنہائی کی

ہر ایک گوشہ مکمل ہے خار و خس سے مگر
کمی بس ایک ہے بجلی کی آشیانے میں

کوئی آئے کہ نہ آئے یہ مگر آئی ہے
کتنی دم ساز ہماری شبِ تنہائی ہے

اسی میں کاش محبت کا تجربہ کرتے
جو وقت صرف وہ کرتے ہیں آزمانے میں

نیاز کم نہ سمجھ جذبۂ محبت کو
جہاں کے سارے فسانے ہیں اس فسانے میں

نظر رشیدی : ——— محمد شفیع

نظر رشیدی کے دادا عبدالرحیم، اعظم گڑھ سے کامٹی آئے تھے۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔ پارچہ بافی کی صنعت ان کا ذریعۂ معاش تھی۔ ان کے دو بیٹے تھے: عبدالرشید اور عبدالحفیظ۔ نظر رشیدی کے والد کا نام عبدالرشید تھا۔ انھوں نے ۱۹۶۷ء میں رحلت فرمائی۔ ان کے پانچ بیٹے تھے: محمد عمر انصاری؛ محمد سلیم؛ محمد یوسف؛ محمد شفیع (نظر رشیدی) اور محمد بشیر۔

نظر رشیدی ۲ فروری ۱۹۲۸ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے میونسپل اردو پرائمری اسکول کامٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کی اور نو بھارت ہائی اسکول، کامٹی سے ۱۹۴۷ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ بعد کو حسبِ ضرورت ۱۹۷۱ء میں بالاپور سے ڈی۔ایڈ کا ڈپلوما حاصل کیا۔

جب علم و ادب سے دلچسپی بڑھنے لگی تو حکیم عزیز قدوسی سے فارسی اور مولانا محمد عمر انصاری اطہر سے عربی پڑھی اور ان دونوں زبانوں میں اچھا خاصا عبور حاصل کرلیا۔

نظر رشیدی اقتصادی بدحالیوں کا ابتدا میں بری طرح شکار رہے ہیں۔ اگرچہ کافی کوششوں کے بعد ۱۹۵۸ء میں ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی، کامٹی میں کلرک کی جگہ مل گئی تھی، لیکن اطمینان بخش اور پُرسکون زندگی گذارنے کے لیے یہ سہارا بہت کم تھا۔ آخر کار ان کے ایک کرم فرما نیاز پٹیل کی مسلسل جدوجہد کے بعد میونسپل اردو پرائمری اسکول، کامٹی میں، جہاں وہ کسی وقت طالب علم رہ چکے تھے، ۱۹۶۷ء میں بحیثیت مدرس ان کا تقرر ہوگیا اور یوں عزت و آبرو سے زندگی کے دن گزرنے لگے۔ وہ اب تک اسی جگہ درس و تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ان کی شاعری کی ابتدا طالبعلمی کے زمانے میں ہوئی۔ اقتصادی بدحالی کی وجہ سے ان کی شاعری میں انفرادی رنگ پیدا ہوگیا ہے۔ ان کے یہاں خدا، واعظ، دیر و حرم اور کائنات کے مضامین پہلو بدل بدل کر آتے ہیں۔ کلام میں جو جذبات، شدت، گرمی اور لب و لہجہ ملتا ہے، وہ کامٹی کے دیگر شعرا کے یہاں مفقود ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

نظر فریب یہ منظر دکھائی دیتا ہے — سراب ہے، جو سمندر دکھائی دیتا ہے

خدا کو چشم تصور سے ماورا نہ کہو — بہت قریب سے اکثر دکھائی دیتا ہے

اسے فریبِ نظر کہہ رہے ہیں اہلِ نظر — نقاب جو ترے رخ پر دکھائی دیتا ہے

کوئی بتائے کہ صحرا سے اب کہاں جاؤں — یہاں سے بھی تو مرا گھر دکھائی دیتا ہے

نظر کو شاعرِ آوارہ مت کہو یارو
وہ آدمی تو پیمبر دکھائی دیتا ہے

وہ تصور ہی میں کرتا ہے خدا کو سجدے — آج کعبے میں کوئی اہلِ نظر آیا ہے

رسمِ حرم و دیر سے واقف تو ہوں لیکن
کچھ اور بھی مفہوم خدا میرے لیے ہے

پھر کسے کافر و زندیق کہے گی دنیا
کون سمجھائیگا مفہومِ خدا میرے بعد

مجھ کو گم کردۂ منزل جو سمجھتے تھے نظر
ڈھونڈتے ہیں مرا نقشِ کفِ پا میرے بعد

دیر و کعبہ نظر آتے ہیں فریب آمادہ
راستہ چھوڑ دیں اب شیخ و برہمن میرا

بے خودی میں جی رہا ہے آدمی
ہوش آجائے تو دنیا چھوڑ دے

مرے جرم و سزا کی حد نہ پوچھو
حرم کی قید کا مفرور ہوں میں

معاشیات پہ جب ہے معاشرے کا وجود
خدا کے قہر سے انسان کیوں ڈرائے گئے

نظر فسانۂ اصحابِ کہف سچ نکلا
بدل گیا جو زمانہ تو ہم جگائے گئے

سوچتا ہوں کہ خلاؤں میں ہیں عالم کتنے
اور جنت سے نکالے گئے آدم کتنے

نظر اک دن خدا کی جستجو میں
پہنچنا ہے مقامِ گمرہی تک

بھوک سے تھی میرے چہرے پہ نقاہت آشکار
اور واعظ صبر کی تلقین فرماتے رہے

رفتہ رفتہ بڑھتا جاتا ہے شعورِ بندگی
ہو رہے ہیں بے نیازِ کعبہ و بتخانہ ہم

پکارتے ہیں عبث شیخ و برہمن مجھکو
حدودِ دیر و حرم سے گزر چکا ہوں میں

مجھے کشاکشِ دیر و حرم سے کیا مطلب
مری نگاہ میں یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے

یہاں کسی کے نقوشِ قدم نہیں ملتے
یہ کس مقام پہ ٹھہرا ہے کارواں میرا

ہے تصور میں خلد کا عالم
اور مری زندگی عذاب میں ہے

ستم تو یہ ہے کہ دونوں ہیں برق کی زد میں
اب اپنی فکر کروں میں کہ آشیانے کی

توہینِ زندگی کی گوارا نہ ہو سکی
مرنے کا تذکرہ تھا مجھے بار سا لگا

کانوں میں کیوں نہیں مرے آئی صدائے غیب
حالانکہ میں خدا سے دعا مانگتا رہا

مانا کہ معتبر ہیں جنوں کی حکایتیں
اپنا تو ہوش میں بھی گریباں پھٹا رہا

کرنا پڑا مجھے بھی نظر اعتبارِ زیست
یہ وہ فریب تھا جو حقیقت بنا رہا

موت کی آرزو، ارے توبہ
جینے والے تجھے ہوا کیا ہے

شمس : ــــــ ریاض الرحمن

شمس ایک متوسط الحال اور مذہبی خاندان کے چشم و چراغ ہیں۔ ان کے دادا کا نام حافظ محمد بخش ابن حافظ یار محمد تھا۔ ان کا خاندان مئو (ضلع اعظم گڑھ) کا رہنے والا تھا۔ لیکن ان کے پردادا نقلِ مکان کر کے کامٹی چلے آئے تھے۔ والد کا نام محمد سعید تھا۔ وہ بھی حافظِ قرآن تھے۔ انھیں حج کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ بہت متقی اور پرہیز گار تھے۔ ساری عمر مساجد میں امامت کرتے رہے۔ انھوں نے ۲۳ اکتوبر ۱۹۶۰ء کو رحلت کی۔ پانچ بیٹے (حافظ محمد نذیر، حافظ محمد ظہیر، حافظ محمد بشیر، ریاض الرحمن شمس، محفوظ الرحمن) اور تین بیٹیاں ہوئیں۔

شمس ۲۸ مئی ۱۹۲۸ء کو راج نانڈ گاؤں (چھتیس گڑھ، مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد بسلسلۂ امامت سکونت پذیر تھے۔ ان کے بچپن اور نوجوانی کے ایام اسی سرزمین پر گذرے، اس لیے ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھی وہیں پائی۔ جب ۱۹۴۵ء میں اپنے والد کے ساتھ کامٹی آئے تو مولوی محمد ابراہیم شاہ سے عربی اور برادر بزرگ حافظ محمد نذیر سے فارسی پڑھی۔ چونکہ عربی فارسی کی تحصیل بہت حد تک اعلا درجے کی تھی، اس لیے ان زبانوں پر ملکہ حاصل ہو گیا۔ اس میں ان کی کوشش اور مطالعے کا دخل زیادہ ہے۔

ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء میں ہوا۔ اولاً افسانے اور تنقیدی مضامین لکھتے رہے۔ بعد کو کامٹی کے شاعرانہ ماحول سے متاثر ہو کر شعر کہنے لگے اور شاطر حکیمی سے کلام پر اصلاح لینا شروع کی۔ جلد ہی ان کی تخلیقات اخبارات و رسائل

میں چھپنے لگیں ۔ اس سے ان کے حوصلے بلند ہو گئے ۔

چونکہ ادبی کتابوں کا گہرا مطالعہ ہے، اس لیے بہت سوچ سمجھ کر شعر کہتے ہیں۔ ان کے فکر و خیال میں گہرائی و گیرائی ملتی ہے ۔ اگرچہ کئی اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے، لیکن اصل میں قطعات اور نظموں کے شاعر ہیں ۔ ان کی نظمیں قومی، سماجی اور انقلابی موضوعات پر مشتمل ہیں ۔ ان میں وارفتگی، جوش، تاثر جذبات اور دلی کیفیات پائی جاتی ہیں ۔ کہیں کہیں موجودہ زمانے کی بدعنوانیوں پر لطیف طنز ملتا ہے ۔ زبان شیریں اور پُر لطف ہے ۔ دو نظمیں ملاحظہ کیجیے :

پیغام :

آ گیا ہے خوبیٔ قسمت سے پھر ہنگامِ عید ہو رہی ہے کیف و سرمستی میں پھر گفت و شنید
مل گئی ہے پھر ہمیں گنجینۂ دل کی کلید لگ رہے ہیں ہر طرف سے نعرۂ ہل من مزید

قلبِ غم خوردہ بسانِ غنچہ و گل کھل گیا
لوحش اللہ، چاک دامانِ تمنا سل گیا

یہ تو سب سچ ہے مگر اتنا رہے ہر دم خیال شیشۂ مہر و وفا میں آ نہ جائے کوئی بال
رنگ دکھلانے لگیگا ورنہ پھر دورِ زوال کام کچھ آتا نہیں افسانۂ جاہ و جلال

کتنے پانی میں ہیں یارانِ وطن یہ بھی تو دیکھ
اور خود کیسا ہے اپنا بھی چلن یہ بھی تو دیکھ

اور یہ بھی دیکھ کیا ہے مقصدِ اہلِ فرنگ کس لیے دنیا ہوئی جاتی ہے آمادۂ جنگ
رفتہ رفتہ ہو رہے ہیں کس لیے بے نام و ننگ پڑ گئی ہے ماند کیوں کچھ کر گذرنے کی اُمنگ

اب بھی کر لیں ہم اگر اس عیدِ قرباں پر یہ عزم
اپنے دل سے اب مٹنے دینگے نقشِ ضبط و عزم

پھر کوئی طاقت ہمیں ہرگز ہلا سکتی نہیں ضو فگن ہوگی دلِ غمناک میں شمعِ یقیں
نورِ عرفانِ خودی سے جگمگائے گی جبیں قطعۂ فردوس بن جائیگی یہ جھلسی زمیں

اتحادِ باہمی ہے حاصلِ عمرِ رواں
فاش ہو جاتے ہیں اس سے رازہائے کن فکاں

گوہرِ اک دل میں ہے اب فہم و فراست کا گزر — کیوں نہیں پڑتی ہے اپنے آپ پر تیری نظر
سارے گلشن میں ہے تو ہی ایک شاخِ بے ثمر — تختۂ مشقِ ستم ہی کیا رہیگا عمر بھر

آج بھی پہچان لے گا تو اگر اپنا مقام
اب بھی آسکتی ہے دنیا تیرے زیرِ انتظام

ساری دنیا میں بس اک تو ہی تو ہے خوار و زبوں — اے مسلماں آج کس کا اس قدر ارزاں ہے خوں
بڑھ رہا ہے ہر طرف کتنا بغاوت کا جنوں — کارگر کتنا ہوا ہے ظلم و دہشت کا فسوں

ہے مسلماں اک کھلونا پنجۂ اغیار میں
لٹ رہی ہے اس کی حرمت کوچہ و بازار میں

جب تلک ہوتا نہیں ہے دل کو احساسِ زیاں — راہ پر آتا نہیں ہے زندگی کا کارواں
ہر جگہ بے نام ہوتا ہے وجودِ ناتواں — ساتھ اس کے رہتی ہے ہر وقت مرگِ ناگہاں

شہہ نشیں اے شمس ہوتے ہیں وہی اس دہر میں
شہدِ ہمت جو ملا دیتے ہیں جامِ زہر میں

نوائے وقت :

اے مرے دوست نہ کر مجھ سے تقاضائے غزل

ایک مدت سے ہیں بھولے ہوئے یارانِ وطن — سرمئی شام میں پھیلا ہوا وہ رنگِ شفق
شوخیاں بادِ صبا کی وہ سمن زاروں میں — شرمگیں عارضِ تاباں سے وہ زرپاش طبق
کون اب چھیڑیگا ذکرِ شہہ شمشاد قداں — کون اب آ کے کریگا لب و رخسار کی بات
کون اب کاکلِ پیچاں کے کہیگا قصے — کون اب لائیگا اخلاص و وفا کی سوغات
اب تو کچھ اور ہی عالم ہے جہانِ نو کا — ہر طرف کیسا یہ طوفانِ ہلاکت ہے بپا
یک بیک کس نے یہ پھر چھیڑی ہے "اگنی بینا" — آگ اور خون کا ہر سمت سے سیلاب اٹھا
آج بنگال کے جادو میں اثر آیا ہے — اوج پر آج نظر آتا ہے جعفر کا کمال

خون میں ڈوب گئے کتنے سراج الدولہ
ہو گئے کتنے جواں سال ارادے پامال

تا بہ کے آگ اگلتی ہوئی توپوں کی گرج
پھیلتے جائینگے یہ شہرِ خموشاں کب تک

دورِ وحشت کے تنِ مردہ میں ہے جان ابھی
خندہ زن ہونگے یہاں غولِ بیاباں کب تک

گم کہاں ہو گیا گیتا انجلی کا نغمہ
ہیں کہاں ویدِ مقدس کے مہکتے ہوئے پھول

پڑ گئی کیسی یہ آئینۂ انجیل پہ گرد
ڈھونڈتے کس کو ہیں قرآن کے پاکیزہ اصول

عہدِ حاضر ہے کہ گرتی ہوئی دیواریں ہیں
کیوں کسی دل میں نہیں عظمتِ انساں باقی

رنگ اور نسل ہے معیارِ شرافت اب بھی
اب بھی ہے مفلس و مظلوم کا درماں باقی

اک طرف ہم نے کیا چاند ستاروں کو اسیر
اک طرف تنگ دلی نے یہ دکھائے منظر

جو نہیں ہم سے وہ جینے کا سزاوار نہیں
اب بھی رہ گیا انسان کا مقصودِ نظر

اپنے نقصان کا احساس ہو گا جس کو
وہ نہ ہو گا کبھی شائستۂ الطافِ خدا

پڑنے پائے نہ کہیں وقت کے ماتھے پہ شکن
آ ہی جائے نہ کہیں تا بہ گلو دستِ قضا

اے مرے دوست نہ کر مجھ سے تقاضائے غزل

قطعات:

ترے خیال کے رنگین گلستاں سے دور
میں جا رہا ہوں تمنائے خوں شدہ لیکر
مجھے حیات کی دلچسپیوں سے کیا مطلب
غمِ حبیب خریدا ہے ہر خوشی دے کر

نوجواں ہیں جوہرِ علم و ہنر سے آشنا
لڑکیاں ہیں زیورِ تعلیم سے آراستہ
ذکرِ تہذیب و تمدن ہے کچھ اتنا ان دنوں
کہکشاں کو راہ دکھلاتا ہے گویا راستہ

اک طرف عام ہوئے عقل و خرد کے چرچے
اک طرف بڑھنے لگا اپنے پرائے کا خیال
اب کسے وحدتِ آدم کی تمنا ہو گی
عدل و انصاف ہوئے جاتے ہیں اک امرِ محال

اعجاز : ——— محمد سعید

ان کے بزرگوں کا وطن شہزاد پور (ضلع فیض آباد) ہے۔ وہیں سے ان کا خاندان کامٹی آیا تھا۔ ان کے والد کا نام محمد اللہ تھا، جو سوداگر پیشہ تھے۔ موصوف انتہائی نیک، باوضع اور صوم وصلوٰۃ کے پابند تھے۔

اعجاز اپنے والد کے اکلوتے بیٹے ہیں۔ ۱۹۲۲ء میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم سراسر مذہبی علوم پر مشتمل ہے۔ ناظرہ اور حفظِ قرآن کے سلسلے میں انھوں نے حافظ محمد، حافظ مطیع الرحمٰن اور الحاج محمد عثمان سے استفادہ کیا۔ اس کے بعد جامعہ عربیہ اسلامیہ ناگپور میں داخلہ لیا۔ یہاں قرأت سیکھی اور درسِ نظامی کا تکملہ بھی کیا۔ مولوی عالم کی سند ناگپور یونیورسٹی سے ۱۹۴۸ء میں حاصل کی۔ ایک سال بعد جامعہ کے سالانہ جلسۂ عام میں ان کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی گئی۔

اعجاز کٹر حنفی المسلک ہیں۔ سلسلۂ طریقت میں سید امام علی شاہ مجددی نقشبندی (ف: ۱۹۵۷ء) کے مرید ہیں۔ انھیں پارسال حج کا شرف حاصل ہوا ہے جب گنبدِ خضریٰ کی زیارت کر رہے تھے تو بے اختیار ان کی زبان سے یہ شعر نکل پڑا، جو اُن کے عاشقِ رسولؐ ہونے کا ثبوت فراہم کرتا ہے:

ان سے مل کر مجھے ہوا محسوس
ان سے ملنا بہت ضروری تھا

خوش گفتار، ملنسار اور برجستہ گو ہیں۔ بات میں بات پیدا کرنے میں مہارت رکھتے ہیں۔ شعلہ بیان مقرر ہیں اور اس میں ملک گیر شہرت کے مالک ہیں۔ اپنی خوش الحانی اور مخصوص ترنم کی وجہ سے مشاعروں میں بہت پسند کیے جاتے ہیں۔

انھوں نے طالبعلمی کے زمانے میں شاعری شروع کی اور کلام پر اصلاح کے

لیے حافظ انور کا انتخاب کیا۔ چندے شاطر حکیمی سے بھی مشورہ رہا۔ اصنافِ سخن میں نعت، غزل، قطعہ اور رباعی میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کا کلام کلاسکی لب و لہجے کا ہے، جس میں موسیقیت اور تغزل کا عنصر غالب نظر آتا ہے۔ زبان و بیان کی پختگی ان کا مابہ الامتیاز ہے:

انقلابات کا میں خود ہی سبب تھا شاید
وقت نے پھر کبھی پلٹا نہ لیا میرے بعد

یاد آئے نہ انھیں میری تباہی کا سبب
اس لیے آئینہ دیکھا نہ گیا میرے بعد

بہار آپ کے پیکر کا ایک سایہ ہے
جدھر ہوں آپ خراماں اُدھر بہار چلے

کچھ اور اس کے سوا مقصدِ حیات نہیں
یہ چلتی سانس ہے جب تک تو ذکرِ یار چلے

وہ ہنس کے پوچھ رہے ہیں سبب تباہی کا
خوشا سوال! جو اپنی جگہ جواب بھی ہے

یہ ذوقِ تجسس ہے کہ فیضانِ توجہ
ہر سمت مری چشمِ تمنا نگراں ہے

فرصت نہ تھی مسائلِ دوراں کے ذکر کی
اپنی جگہ میں آپ ہی اک مسئلہ رہا

سایۂ گل میں ذرا آنکھ لگی تھی اعجاز
بس وہی خواب بنا دام گرفتاری کا

دیکھ رہا ہے حال خرد کا
دیوانہ کیا ہوش میں آئے

ترا تصور رنگیں، ترا خیالِ حسیں
یہی تو ہیں، مری رنگینیوں کے افسانے

تہمتِ دید کا الزام ہے مجھ پر بیجا
میں نے دیکھا ہے تجھے لوگوں کی دیکھا دیکھی

ظالم تری تصویر بنانے کا یہ انجام
ہاتھوں کو مصور کے قلم دیکھ رہا ہوں

سمٹ کر داستانِ زندگانی
تمہارا نام ہوتی جا رہی ہے

ہوس کاری رنداں توبہ توبہ
صراحی جام ہوتی جا رہی ہے

خرام ناز کی شہرت نہ پوچھو
صبا گم نام ہوتی جا رہی ہے

اک تیری تمنا نے کچھ ایسا نوازا ہے
مانگی ہی نہیں جاتی اب کوئی دعا ہم سے

میں نے اشکوں کو تبسم میں سمویا اعجاز
اور دنیا نے یہ سمجھا کہ میں رنجور نہیں

اب بہار آنے کا کوئی راستہ باقی نہیں
گل فروشانِ چمن سارے چمن پر چھا گئے

رباعیاں :

اب حیلہ طرازی کا نہ غم دے ساقی
صہبا مجھے از راہِ کرم دے ساقی
ہوں منتظرِ لطف، دمِ آخر ہے
اب جام دے للہ نہ دم دے ساقی

ہاں چہرۂ جذبات دمک جاتا ہے
شعلہ سا مرے دل میں بھڑک جاتا ہے
یاد آتا ہے جب مجھ کو رُخِ روشنِ دوست
آئینۂ احساس چمک جاتا ہے

رکھ شیشہ و ساغر کی عنایت پہ نظر
میخواروں کے جذبات کو پامال نہ کر
ہاں دیکھ یہ ہے رہ گزر میخانہ
اے گردشِ ایام دبے پاؤں گزر

عرفان : ——— عبد الربّ

ان کے جدِ امجد ۱۸۵۷ء کی قیامت خیز شورشوں کے بعد شمالی ہند سے کامٹی آئے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ عرفان ۲۹ دسمبر ۱۹۳۴ء (۲۲ رمضان المبارک ۱۳۵۳ھ) کو کامٹی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حکیم حاجی شمس الدین نے ان کا تاریخی نام "صغیر احمد" تجویز کیا تھا۔ لیکن ان کے نانا حاجی ملاّ عبدالوارث نے، جن کا شمار اس وقت کامٹی کے علما میں تھا، ان کا نام عبدالربّ رکھا۔ خاندانی پیشہ پارچہ بافی ہے۔

ان کی تعلیم کا آغاز ۱۹۴۴ء میں ہوا۔ اگرچہ ان کے بچپن میں خاندان پر افلاس و ادبار کی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں، لیکن والدہ کی شفقت؛ برادرِ نسبتی محمد یٰسین ابن ملاّ محمد سعید کی اعانت اور دیگر مخیر حضرات کی حوصلہ افزائی نے انھیں حالات کی تلخی کا زیادہ احساس نہیں ہونے دیا اور وہ کسبِ معاش کی مشقت کے ساتھ ساتھ تحصیلِ علم میں بھی مصروف رہے۔ انھوں نے ربانی ہائی اسکول، کامٹی سے ۱۹۵۵ء میں میٹرک کا امتحان

پاس کیا ۔ اس میں انھیں پورے صوبے میں تیرہواں مقام حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد انٹرمیڈیٹ (۱۹۵۷)، بی اے (۱۹۵۹ء) اور ایم اے فارسی (۱۹۶۱ء) کے امتحانات بھی ناگپور مہاودیالیہ، ناگپور سے امتیازی نمبروں سے پاس کیے ۔ انھیں بی اے میں ناگپور یونیورسٹی میں ساتواں مقام ملا تھا اور ایم اے فارسی میں آرٹس فیکلٹی میں اوّل آنے کے باعث خان بہادر ایچ ایم ملک طلائی تمغے سے سرفراز کیے گئے تھے ۔ بعد کو انھوں نے ۱۹۷۱ء میں ناگپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا اور ۱۹۷۹ء میں اسی یونیورسٹی سے فارسی میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ۔ نعمت خان عالی ۔ عہد، شخصیت، فن اور کارنامے، ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا۔ فارسی میں ایم اے کرنے کے فوراً بعد ہی، ۱۳ نومبر ۱۹۶۱ء کو فارسی کے استاد کی حیثیت سے وِدربھ مہاودیالیہ امراؤتی میں ان کا تقرر ہوگیا۔ وہ ۲۰ جون ۱۹۶۴ء کو شعبۂ فارسی کے صدر بنے اور ۲ دسمبر ۱۹۷۸ء کو ناگپور یونیورسٹی کے فارسی عربی بورڈ آف اسٹڈیز کے چیرمین منتخب کیے گئے ۔

شاعری کا ذوق والد سے ورثے میں ملا ہے ۔ شعر گوئی کا آغاز آٹھویں جماعت سے ہوا ۔ اس میں شاطر حکیمی کے آگے زانوے تلمذ تہہ کیا ہے ۔ ان کی شعری تخلیقات اور مضامین بیسویں صدی دہلی، آج کل دہلی، اور خیال کامٹی میں چھپ چکے ہیں ۔ دو کتابیں : فیضی فیاضی ۔ احوال و آثار اور اردو ڈراما اندر سبھا سے انار کلی تک اشاعت کی منتظر ہیں ۔

عرفان شاعری کے قدیم اقدار کا احترام کرتے ہیں اور جدید اقدار کو بھی پسند کرتے ہیں، لیکن مضمون پر زبان و بیان کی صحت کو قربان کر دینے کے قائل نہیں ہیں ۔

نمونۂ کلام :

جرأتِ شوخیِ گفتار تک آ پہنچے ہیں
دل کے شکوے لبِ اظہار تک آ پہنچے ہیں

زلفِ جاناں کی تمنا میں ہم اربابِ جنوں
بڑھتے بڑھتے رسن و دار تک آ پہنچے ہیں

جاگ اٹھا پلکے گھنی چھاؤں تھکن کا احساس
ہم یہ کس منزلِ دشوار تک آ پہنچے ہیں

اپنی رسوائی کا عرفان کچھ احساس نہیں
یہ چرچے اب کوچہ و بازار تک آ پہنچے ہیں

نہ غم کا غم، نہ خوشی کی خوشی رہی مجھ کو
یہ کس مقام پہ لے آئی زندگی مجھ کو

کسی بہانے سہی اک جوابِ غم تو ہوا
کہ اپنے حال پہ آج آ گئی ہنسی مجھ کو

سکوتِ شب میں جو پتا کوئی کھڑکتا ہے
دلِ حزیں عجب انداز سے دھڑکتا ہے

یہ دوستوں کی عنایت کہ آج میں ہوں وہاں
خود اپنے سائے سے انساں جہاں بھڑکتا ہے

دل کہ نیرنگیِ حالات میں کیا کیا نہ لگے
کبھی اپنا نظر آئے، کبھی بیگانہ لگے

میری رودادِ غم، دل کے سوا اور ہے کیا
وہ حقیقت جو بیاں کیجیے افسانہ لگے

ہم نفس ہو تو بیاباں بھی نہیں شہر سے کم
جب نہ ہو ساتھ کوئی، شہر بھی ویرانہ لگے

رہروِ اگر رہ وہاں ہے تو جھکا دیجیو سر
جس جگہ پھول سے بکھرے ہوئے پتھر دیکھو

اک خموشی کے سوا کچھ نہ ملے گا یارو
کبھی بجھتے ہوئے جسموں میں اتر کر دیکھو

کر چکے بیٹھ کے کشتی میں جزیرے کی تلاش
ذرا موجوں کی بلندی پہ بھی چڑھ کر دیکھو

دل شیشۂ ہوس تو نہیں ہے، کہ ٹوٹ جائے
وہ آ ملکے دیکھ لیں آج اپنا سنگِ جور

بے نام سی خوشی کے لیے مر رہا تھا میں
سکھلا دیئے غموں نے مجھے زندگی کے طور

کس بام کی تلاش ہے کس در کی جستجو
پھرتا ہے شہر میں کوئی آوارہ، کو بہ کو

منزل، غبارِ راہ میں گم ہو کے رہ گئی
اب اس مقام پر ہے مرا ذوقِ جستجو

دامانِ زندگی ہے جب اس درجہ تار تار
کیوں میرے غم گسار کریں زحمتِ رفو

احباب کیا سمجھ کے مجھے دیکھنے لگے
نام آ گیا کسی کا جو دورانِ گفتگو

قطعہ :

اے ہم سفرو! خواہشِ تمام سفر کیا
چلنا ہی مقدر ہو تو منزل پہ نظر کیا

زلفوں کا بکھرنا، رخِ روشن کا نکھرنا
ہے اس کے سوا سلسلۂ شام و سحر کیا

یونس افسر : ــــــــــــ محمد یونس

عزیز قدوسی کے چھوٹے بھائی ہیں ۔ ۲۸ فروری ۱۹۳۱ء کو پیدا ہوئے ۔ ربانی ہائی اسکول کامٹی سے نویں جماعت کا امتحان پاس کیا ۔ مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے، لیکن معاشی پریشانیوں کی وجہ سے یہ سلسلہ منقطع ہوگیا ۔ فارسی برادرِ بزرگ سے پڑھی ۔

کسبِ معاش کے لیے کامٹی ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی میں ملازمت اختیار کی ۔ یہاں تقریباً ۲۰ سال ملازم رہے ۔ اب گھر ہی میں ایک چھوٹا سا دواخانہ کھول لیا ہے، جو حکومتِ مہاراشٹر سے منظور شدہ ہے ۔

اصنافِ سخن میں غزل، نظم، قطعہ اور تاریخ گوئی سے شغف ہے ۔ زود گو شاعر ہیں ۔ ابتدا میں شمس اور شاطر حکیمی سے مشورہ کیا ۔ چندے عزیز قدوسی سے بھی استفادہ کیا ہے ۔ نمونۂ کلام :

بے ضرورت گفتگو کے ہم کبھی قائل نہیں
بات ہے سچی تو پھر اظہار ہونا چاہیئے

کیں کرتے ہیں اہلِ حوصلہ شکوہ مقدر کا
جنھیں آنا ہی تھا منزل پہ وہ بالِ پر آئے

جان دے دینے سے ہوتی نہیں تکمیلِ وفا
یہ تو اظہار ہوا جان سے بیزاری کا

رہ کے زندہ ہمیں دینا تھا محبت کا ثبوت
ہم نے ہنس ہنس کے غمِ یار سے باتیں کی ہیں

تجھ سے قریب رہ کے تجھے دیکھتا رہا
ہم سے تو خوش نصیب ترا آئینہ رہا

اب اُس مقام پر ہے مرا شوقِ جستجو
جب بھی نظر اٹھی ہے ترا سامنا رہا

خندۂ گل بھی افسر غضب ہو گیا
کتنے غم کا سبب اک ہنسی ہو گئی

جلووں کے کچھ آثار ہیں چلمن سے نمایاں
یہ دیکھ رہا ہوں کہ کوئی دیکھ رہا ہے

پھر نگاہِ ناز ہے مائل بہ احساں دیکھنا نامکمل ہے ابھی شاید مری روداد غم

خلش قادری : ـــــــــــ مشتاق احمد

منشی اخگر کے صاحبزادے ہیں لہٰذا شاعری کا شوق ورثے میں پایا ہے ۔ جب اپنا پہلا شعر اپنے والد کو سنایا تو انھوں نے اس شغل سے باز رہنے کی نصیحت کی ۔ مگر یہ کافر منھ سے لگ جائے تو کہاں چھٹتی ہے ؛ چنانچہ شعر گوئی جاری رہی اور شاطر حکیمی کا تلمذ اختیار کیا ۔

۲۹ جنوری ۱۹۳۵ء کو پیدا ہوئے ۔ تعلیم بے قاعدہ رہی ۔ چوتھی جماعت پاس کرنے کے بعد اسکول چھوڑ دیا ۔ پھر میٹرک کا امتحان اپنے طور پر پاس کیا ۔ مطالعے کا شوق راسخ ہے ۔

ان کا احساسِ جمال نہایت توانا ، جاندار اور پُراثر ہے ۔ اپنی حسن پرستی کا اعتراف خود ان کو بھی ہے ۔ مزاج میں رُومانیت اور رنگینی ہے ۔ بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں ۔ غزل کے قدیم وجدید ، دونوں رجحانات پر گہری نظر رکھتے ہیں ۔ روایت کی پاس داری اور جدّت کی گل کاری نے ان کی شعری فضا کو معتدل اور فرحت بخش بنایا ہے ۔ قلبی واردات اور عصری حالات کی ترجمانی میں شعر کے تقاضوں کو نظر انداز نہیں کرتے ۔ اگر سنجیدگی اور باقاعدگی سے اشاعتِ کلام پر توجّہ کرتے تو آج ان کا بھی شمار علاقۂ وِدربھ کے منتخب نمائندہ شاعروں میں ہوتا :

نیکی کے ترازو میں مجھے تولنے والا	چُپ ہو کے رہا مجھ کو بُرا بولنے والا
طاقتِ ضبط کھو نہ دے وہ بھی	ہنس رہا ہوں کہ رو نہ دے وہ بھی
منظرِ گل حسین تر ہی سہی	کوئی کانٹا چبھو نہ دے وہ بھی
تک رہا ہے جو خشک آنکھوں سے	میرا دامن بھگو نہ دے وہ بھی
کس کو معلوم تھا پہلے وہ جدائی دیگا	پھر ستم یہ کہ ہر اک شے میں دکھائی دیگا

خشک ہوئے آنکھوں کے چشمے ہونٹوں سے مُسکان گئی
شہر میں اتنی دھول اڑی، سب چہروں کی پہچان گئی

کیا چھپائیں کہ کیا رہا دل میں
اب تو آنکھوں میں ہے، جو تھا دل میں

خوشیوں کے سلسلے راس آئے جسے کبھی
غم کی تمازتوں سے وہ چہرا نکھر گیا

سمٹا رہا وجود میں ہنگام گفتگو
خاموش ہوگیا تو فضا میں بکھر گیا

سامنے بے جھجک نہ آ جانا
آئینہ باشعور ہوتا ہے

زندگی کر مجھے تسلیم کہ دنیا میں نہیں
مجھ سے بہتر ترے انداز سمجھنے والا

میں جس کے واسطے دنیا سے دور دور رہا
مرے قریب سے آکر گزر گیا وہ بھی

ہم کہاں حال انھیں اپنا سنا پاتے ہیں
لفظ چنتے ہیں تو مفہوم بکھر جاتے ہیں

خلیل انجم : ———— خلیل احمد

نیاز انجم کے چھوٹے بھائی ہیں۔ ۱۸ مارچ ۱۹۳۸ء کو پیدا ہوئے۔ ربانی ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ فی الحال آرڈننس فیکٹری امباجھیری ناگپور میں ملازم ہیں۔ انھوں نے ۱۹۶۰ء میں شاعری شروع کی۔ شاطر حکیمی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہیں:

نظر ملا کے کبھی گفتگو نہیں کرتے
مرے قریب بھی ہیں، مجھ سے اجتناب بھی ہے

آپ کے تصور نے کر دیا ہے گم ایسا
مرے ہم نشیں مجھ کو فلسفی سمجھتے ہیں

مسرتیں نہ سہی، غم کی کلفتیں ہی سہی
صلہ وفا کا جو پانا تھا ہم نے پایا ہے

دل تیری نگاہوں میں شیشہ ہی سہی لیکن
آواز نہ پیدا ہو اس طرح شکستہ کر

آؤ تاریک فضاؤں میں نکھرنا سیکھیں
ہر شبِ غم کی سحر ہو، یہ ضروری تو نہیں

اندازِ تکلم میں خنجر کی روانی ہے
پہچان لو قاتل کو ہم نام نہیں لینگے

شہر کے دانشوروں میں تھا ہمارا بھی شمار
ہاں مگر اس دور کو گزرے ہوئے عرصہ ہوا

تاباںؔ : ــــــــ مظفّر حسین

دادا کا نام فیض ادخان تھا۔ ان کے والد محمد جعفر ۴ ۔ ای ایم ای سنٹر کامٹی میں بحیثیتِ سپاہی ملازم تھے ۔ اب سبکدوشی کی زندگی بسر کر رہے ہیں ۔

تاباں ۱۹۴۱ء میں پیدا ہوئے ۔ اس علاقے میں ۱۹۴۴ء میں چیچک کی وبا زوروں پر تھی، جس کی زد میں تاباں اور ان کے چھوٹے بھائی عبدالکریم آگئے ۔ عبدالکریم اس بیماری کا شکار ہو کر چل بسے اور تاباں بصارت سے محروم ہوگئے ۔ وہ کم سنی ہی سے ذہین اور ہونہار تھے ۔ قوتِ حافظہ بھی اچھی تھی ۔ لہٰذا حافظ محمد بشیر، امام داروغہ مسجد، کامٹی کی نگرانی میں چودہ سال کی عمر میں قرآن مجید کا حافظہ مکمل کرلیا ۔ بعد ازاں ۱۹۵۷ء میں انھی کی تحریک پر احیاء العلوم، مبارکپور (اعظم گڑھ) میں داخلہ لیا ۔ اس وقت مولانا شمس الدین وہاں کے ناظم اعلا اور مولانا محمد یٰسین مفتی تھے ۔ انھوں نے احیاء العلوم میں قاری محمد ظہیر الدین پورا معروفی سے قرأت کا فن سیکھا ۔ فارسی کی تعلیم قاری زین العابدین سے حاصل کی ۔

ان کی شاعری کی ابتدا ۱۹۵۴ء میں ہوئی ۔ پہلے حکیم عزیز قدوسی اور الوز کامٹوی سے مشورہ کیا ۔ لیکن ۱۹۶۱ء میں جب ان کے والد ناگپور میں آباد ہوگئے تو مولانا ناطق گلاوٹھوی سے اصلاح لینے لگے ۔

تاباں آج تک معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہیں ۔ اس کے باوجود ان کے شعری ذوق پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑا ۔ بڑی روانی سے شعر کہتے ہیں ۔ ان کی غزلوں میں سلاست و سادگی کے ساتھ ساتھ تاثرات بھی ملتے ہیں :

آپ آئے اور شامِ غم گئی ــــ چاندنی بھی چلتے چلتے تھم گئی
کر رہے ہیں پھول کیوں دامن کو چاک ــــ بول کر کلیوں سے کیا شبنم گئی
آتشِ غم تیز کل جیسی نہیں ــــ راکھ انگاروں پہ شاید جم گئی

میکشی آتی نہ تھی تاباں ہمیں
میکدے میں بات پھر بھی جم گئی

رہ رہ کے یاد آتے ہیں ماضی کے حادثات کس طرح میں بھلاؤں کہ دل بھولتا نہیں

وہ اظہارِ تمنا پر ذرا لب تو ہلا دیتے
نہیں کہتے نہیں ہوتا، جو ہاں کہتے تو ہاں ہوتا

حسن کی رنگینیاں کچھ یوں نمایاں ہو گئیں خود مری نظر میں حجابِ روئے جاناں ہو گئیں
ہے یہ ان کے روئے روشن کے تصور کا کمال ہجر کی تاریک راتیں جلوہ ساماں ہو گئیں
اٹھ گیا بزمِ جہاں سے کون ایسا خوش نصیب جس کے ماتم میں تری زلفیں پریشاں ہو گئیں
رہ گئی تاباں قیامت میں ہماری آبرو
رحمتیں جب پردہ پوشِ داغِ عصیاں ہو گئیں

تصورات کی دنیا میں کھو گیا ہوں میں کسی سے محوِ تکلم ہے زندگی میری
تمہاری یاد میں کھویا ہوا سا رہتا ہوں چلے بھی آؤ کہ گم سم ہے زندگی میری
فروغِ حسنِ مجسم کے فیض سے تاباں جوابِ تابشِ انجم ہے زندگی میری
دل دیا ہے تو تونگر بھی بنا دے مجھ کو
کوئی سائل بھی مرے در سے نہ خالی جائے

مدحت الاختر ـــــــ محمد مختار

مدحت الاختر کا تذکرہ ڈاکٹر ظ انصاری کے ان الفاظ سے شروع کرنا بہتر ہوگا۔[۱]

"ناگپور کے پاس اگلے وقتوں کا ایک فوجی کیمپ قصبہ ہے کامٹی' مدحت الاختر وہیں سے پندرہ سال پہلے اٹھے، 'منافقوں میں روز و شب' ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے، مختصر سا (شعر کے صرف ۳۰ صفحے)۔ اس میں غزلیں ہی غزلیں ہیں۔ وہ بھی مختصر سی، پانچ سات شعر فی غزل، مگر بھرتی کہیں نہیں"

۱۔ کتاب شناسی از ظ انصاری (اگست ۱۹۸۱ء)، ص: ۲۰۱

ہر غزل ایک کانٹا لیے ہوئے ؛ جس میں توجہ کا دامن الجھتا ہے۔

اس ممتاز اور باوقار شاعر کا تعلق ایک متوسط الحال خاندان سے ہے، جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد تلاشِ معاش میں اعظم گڑھ سے کامٹی آیا تھا۔ ان کے والد کا نام حافظ محمد رحمت اللہ تھا۔
مدحت الاختر ۱۵ مئی ۱۹۴۵ء کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے ۱۹۶۲ء میں ربانی ہائر سیکنڈری اسکول، کامٹی سے میٹرک کا امتحان اول درجے میں پاس کیا اور اردو فارسی میں امتیازی نشانات بھی حاصل کیے۔ اس کے بعد ناگپور مہا ودیالیہ ناگپور میں داخلہ لیا۔ یہاں سے بی اے (۱۹۶۵ء) اور ایم اے فارسی (۱۹۶۷ء) کی ڈگری لی۔ ان دونوں امتحانوں میں بھی انھیں نہ صرف اول مقام ملا بلکہ بی اے میں پوری یونیورسٹی میں جدید زبانوں میں سب سے زیادہ نمبر ملنے پر سر آرتھر بلیز ہیرٹ میموریل سلور میڈل سے بھی نوازے گئے۔ اسی طرح ایم اے کے تمام امتحانات میں سب سے زیادہ نمبر لینے پر خان بہادر ایچ ایم ملک گولڈ میڈل کے مستحق قرار پائے۔ پھر ۱۹۶۹ء میں انھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔ اس میں بھی وہ فرسٹ کلاس فرسٹ آئے تھے۔ انھیں ۱۹۶۹ء سے ۱۹۷۱ء تک ان کے تحقیقی مقالے نظیری نیشاپوری کی تصنیف و تالیف کے لیے ریسرچ فیلوشپ ملتی رہی۔ خوش نصیبی سے انھیں جگدمب مہا ودیالیہ اچل پور (ضلع امراؤتی) کے شعبۂ اردو میں ۱۹۷۰ء میں ملازمت مل گئی۔ جب دوسرے سال ۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو ناگپور مہا ودیالیہ ناگپور کے شعبۂ اردو و فارسی میں ان کا تقرر ہوا تو وہاں سے مستعفی ہو گئے۔ وہ آج بھی درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔
چونکہ ملازمت ملنے کے بعد ان کی ذمے داریاں کافی بڑھ گئی تھیں اس لیے

تحقیقی مقالے کی تکمیل کا موقع عرصۂ دراز تک نہ مل سکا۔ اس کام کو انھوں نے ۱۹۷۸ء میں پورا کیا، جس کے صلے میں ۱۹۷۹ء میں ناگپور یونیورسٹی نے انھیں پی ایچ ڈی کی سند تفویض کی۔

ان کی شعر گوئی کا سلسلہ ۱۹۶۰ء میں شروع ہوا۔ کلام پر اصلاح اردو کے مشہور شاعر کرشن موہن سے بذریعۂ خط و کتابت لی۔ لیکن ۱۹۶۴ء کے بعد اپنے ذوقِ سلیم کو اپنا رہبر بنایا اور پھر کسی کے آگے زانوے تلمذ تہہ نہیں کیا۔

اس علاقے میں ان کا ایک بڑا کارنامہ چاروں اور کی تدوین و اشاعت ہے اس کتاب کو انھوں نے شاہد کبیر کے ساتھ مل کر ستمبر ۱۹۶۸ء میں چھپوایا ہے۔ اس کی طباعت مدھوکر آرٹس ناگپور میں ہوئی ہے۔ اس خوبصورت اور دیدہ زیب کتاب میں ہندوپاک کے اٹھائیس جدید شعرا کی منتخب غزلیں شامل ہیں۔ ان کے کلام کا ایک مختصر مجموعہ منافقوں میں روز و شب دسمبر ۱۹۸۰ء میں فاطمی آرٹ پرنٹرس، مومن پورہ ناگپور کے زیرِ اہتمام شائع ہوچکا ہے۔ اس کتاب پر مغربی بنگال اردو اکاڈمی کی طرف سے ۵۰۰ روپے کا سرٹی فیکٹ آف میرٹ پرائز بھی دیا گیا ہے۔

مدحت کم گو شاعر ہیں، لیکن بہت ہی غور و فکر کے بعد شعر کہتے ہیں۔ ان کے لب و لہجے میں انفرادیت، اور احساسات و جذبات میں صداقت و حقیقت ہے۔ ڈاکٹر ظ انصاری کے الفاظ میں:[۲]

> جدید شاعر کہلانے والوں میں چند علامتوں کا رواج ہو گیا تھا، ان میں سے مدحت الاختر کے یہاں شہر، ہوا اور ریت کی تکرار ملتی ہے، مگر کہیں، کسی مقام پر بے سبب نہیں ملتی، یہ نہیں کہ اندر مال تو ہے پرانے اسٹاک کا اور

۲۔ ایضاً، ص: ۲۰۲

اور باہر سائن بورڈ ٹانگ دیا نئی علامت یا حالیہ تراشی ہوئی ترکیب کا۔

بعض لوگ، جن کے بال پک گئے شعر سازی کرتے کرتے،
ان کی یہ عادت بھی پختہ ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب آگے لکھتے ہیں:

تاہم اس چھوٹے سے ہونہار مجموعۂ کلام میں تازگی ہے خیال کی، بیان کی، انفرادیت ہے احساس کی، تیور کی، شناخت ہے شاعر کی۔ بعض غزلوں میں .... آپ بیتی کے چھینٹے بھی نظر آجاتے ہیں۔ اہم یہ کہ بے چہرگی اور بے لطف یکسانی سے پاک ہے یہ کلام۔ شاعرانہ جرأت ہر پہلو سے ابھرتی ہے۔

چند منتخب اشعار:

زندگی بھر کے گناہوں کو بھلا بیٹھا ہوں
ایک نیکی سے ہوا سب کا ازالہ رَبّی

میں ایک قطرۂ شبنم ہوں دامنِ دل پر
اٹھائے سیکڑوں نیزوں سے آفتاب مجھے

جُدا جُدا ہیں لکیریں سبھی کے ہاتھوں کی
ہجوم میں بھی اکیلا ہی خود کو پاؤں گا

اگر نصیب ہوئی مجھ کو ایک بھی نیکی
میں اپنے سارے گناہوں کو بھول جاؤں گا

میں ترا نقشِ قدم ہوں یہ بجا ہے لیکن
میری حسرت ہے مجھے اور سنوارا جائے

صبح یہ سوچا اب نہ تکیں گے ان کی راہ
شام ہوئی اور آس لگا کر بیٹھ گئے

وہ کہے جھوٹ تو سچ جان کے خوش ہو جاؤں میں
یہ تکلف بھی محبت میں گوارا کیجے

کب اپنے کیے کا مجھے اقرار نہیں ہے
وہ سنگ اٹھائے جو گنہ گار نہیں ہے

روتے ہیں مگر آنکھ سے آنسو نہیں بہتے
ہم سا کوئی دنیا میں ریاکار نہیں ہے

چاہا تھا جس کو چائے کی پیالی میں گھولنا
چمچے کی کپکپی سے وہی راز کھل گیا

دنیا کھڑی ہے میری نگاہوں کے سامنے
بھولے ہوئے سے خواب کی پہچان کی طرح

بچے تو ہنستے کھیلتے واپس ہوئے مگر
جو ریت کے گھروندے تھے لہروں میں بہہ گئے

سر پہ سورج ہے کڑی دھوپ میں جاری ہے سفر
مجھ کو سایہ بھی مرے قد کے برابر نہ ملا

میرے سوا کسی سے نہ ملتا تھا وہ کبھی
میری ہی ضد میں ہر کس و ناکس سے جا ملا

جس کو دیکھا وہی چہرا ترا چہرا نکلا
اجنبی شہر بھی کیا طرفہ تماشا نکلا

مدحت ترے نہ ہونے سے محفل نہ ہوگی کیا
جاری رہے گا سلسلۂ کارِ روز و شب

ملے جلے بھی رہے اور جدا بھی تھے سب سے
اسی ادا کو ہنر اپنی ذات کا کہیے

ملنے والے لاکھ ہوں پھر بھی خفا کوئی نہ ہو
یعنی ہونٹوں کا تبسم بھی مشینی چاہیے

صاحبانِ شہر میں اتنی جسارت بھی کہاں
یہ بھی نیکی ہے جو اقرارِ گنہ گاری کروں

کس کے حصے میں گئی ان کے کرم کی دولت
وہ تو ہر شخص کو محسوس ہوا ہے اپنا

موت آئے تو رہے لب پہ تبسم مدحت
کاش ایسی کوئی نیکی بخدا کر جاؤں

ساحل کی ساری ریت عمارت میں لگ گئی
اب ہم کہاں سے اپنے گھروندے بنائیں گے

جاتے ہیں شاخ شاخ کو دیتے ہوئے دعا
آندھی سے بچ گئے تو اسی رت میں آئیں گے

بھڑک کے اپنے گھروں کو جلا بھی سکتی ہے
ہم اپنی شمع کی لو سے بھی ہوشیار رہیں

تشبیہ تیرے حسن کی پوری نہ ہو سکی
جنت ترے بدن کی ادھوری مثال تھی

سب بے تکلفی کے مزے دل میں رہ گئے
سوچا نہ تھا کہ اتنا مہذب ملے گا تو

جانے والے مجھے کچھ اپنی نشانی دے جا
روح پیاسی نہ رہے آنکھ میں پانی دے جا

غیور جعفری : ——— غیور الحسن

غیور الحسن، تاریخی نام ہے، جس سے سالِ ولادت ۱۳۶۵ھ (۱۹۴۶ء) معلوم ہوتا ہے۔ شاعری کی ابتدا ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ ہوئی اور اس میں اپنے ذوقِ سلیم کو راہبر بنایا۔ فطرتاً اور مزاجاً نشر و اشاعت سے گریزاں ہیں؛ اس لیے کلام بہت کم شائع ہوا۔ محض چند غزلیں ہماری زبان

مورچہ، برگِ آوارہ، تحریک اور کتاب میں آئی ہیں۔

کم گو اور پختہ کار شاعر ہیں۔ شعر کی جملہ اداؤں کے رمز شناس ہیں۔ مطالعہ اگرچہ بالاستیعاب نہیں کیا ہے؛ لیکن نظر کی گہرائی اور گیرائی اس کی تلافی کر دیتی ہے۔ ہندی شاعری کے مطالعے کے ذوق نے زمانۂ حال کی جدید ادبی تحریکوں سے ذہنی قربت بھی عطا کی ہے۔

ان کے جذبات و احساسات پر تعقل و تفکر کا پہلو غالب ہے۔ کلام میں صفائی اور پختگی ہے۔ ہندی کے الفاظ بڑی روانی اور بہاؤ کے ساتھ ان کے شعر میں آتے ہیں۔ لب و لہجہ تیکھا اور طنزیہ ہے؛ جس سے ان کے حالات و کوائف کا اندازہ ہوتا ہے۔

اگر غیور جعفری سنجیدگی اور باقاعدگی کے ساتھ شاعری کی طرف متوجہ ہو جائیں تو کامٹی کی شعری روایت کا سر کچھ اور اونچا ہو سکتا ہے۔

چند منتخب اشعار:

وہاں سے اڑا آنکھ میں بھر گیا
جہاں گرد میں، تیری راہوں میں تھا

وہاں پر آدمی چکرا گیا ہے
جہاں سے راستہ بل کھا گیا ہے

قدم جتنا آگے ہے پیچھے بھی ہے
خود اپنے ہی اندر سٹرک جائیگی

کم بخت کو اتنا بھی احساس نہیں شاید
جینے کے لیے اپنے، اوروں کو دغا دیگا

کچھ یاد نہیں مجھ کو، میں کون ہوں کیسا ہوں
کیا کوئی مجھے میری پہچان بتا دیگا

کتنا سادہ ہے آئینے کی طرح
خوبصورت بھی ہے، نہیں بھی ہے

خوف کھانے کا، نہیں یہ سن نہیں
آدمی ہوگا وہ کوئی جن نہیں

میں گھس چکا ہوں بہت سادگی کے چکر
خدا کے واسطے اب اور یوں نہ چھیل مجھے

کس لیے تیرے میرے بیچ اب تک
دوستی کی خلیج حائل ہے

نشتر : ـــــــــ عبدالرحیم

عبدالرحیم نشتر ۲۶ فروری ۱۹۴۷ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے، جہاں ان کا خاندان ہندوستان کی تقسیم سے پہلے کرج گاؤں (ضلع امراؤتی) سے منتقل ہو کر آباد ہو گیا تھا۔ یہ ان کی زندگی کا ایک دردناک المیہ ہے کہ ان کی پیدائش کے تھوڑے دنوں بعد ہی ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ان کے والد عبدالغنی ایک محنتی، مستقل مزاج اور صابر انسان ہیں۔

نشتر نے ۱۹۶۶ء میں ربانی ہائر سیکنڈری اسکول، کامٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اردو میں پورے بورڈ میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کیے۔ اس کے بعد ناگپور مہاودیالیہ ناگپور میں داخلہ لیا۔ یہاں سے ۱۹۷۳ء میں بی اے اور ۱۹۷۶ء میں ایم اے (اردو) کیا۔ پھر ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال سے بی ایڈ کی ڈگری لی۔ پی ایچ ڈی کی سند ۱۹۸۱ء میں ناگپور یونیورسٹی سے حاصل کی۔ "اردو ادب میں پیروڈی" ان کے تحقیقی مقالے کا عنوان ہے۔

جس زمانے میں ربانی ہائر سیکنڈری اسکول میں زیر تعلیم تھے، ان کی شاعری کا آغاز ہوا۔ اس میں اثر کریمی اور شاطر حکیمی سے استفادہ کیا ہے۔ ابتدا میں وہ روایتی انداز کی غزلیں کہا کرتے تھے یا قطعات وغیرہ۔ پھر ترقی پسند ادب سے متاثر ہوئے۔ لیکن یہ روش بھی انھیں پسند نہ آئی اور جدید لب و لہجہ اختیار کر لیا۔

ان کا کلام ہندو پاک کے موقر جرائد و رسائل میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ دو مختصر مجموعے اعراف (ستمبر ۱۹۷۲ء) اور شام گراں (دسمبر ۱۹۷۸ء) چھپ چکے ہیں۔ ارتکاز کے عنوان سے ۳۸ جدید شاعروں کی منتخب غزلوں کا ایک مجموعہ بھی مرتب کر کے مارچ ۱۹۷۱ء میں چھپوایا ہے۔

نشتر جدید شاعروں میں ایک مخصوص اور منفرد حیثیت رکھتے ہیں ۔ ان کا لب ولہجہ نوکیلا، خاردار اور درشت ہے ۔ لفظیات کے سلسلے میں آزادہ روی کے قائل ہیں ۔ ہندی کے الفاظ اور محاورے بے تکلفی سے استعمال کرتے ہیں ۔ تلفظ اور محلِ استعمال، جذبات و خیالات کے تابع ہوتا ہے ۔ جنسی مسائل و کوائف کا قدرے بے محابا اظہار ان کی خصوصیت ہے ۔ ذاتی تجربات و احساسات انتہائی تلخ اور کڑوے ہیں اور یہ تلخی اور کڑواہٹ ان کے شعروں میں بھی در آئی ہے ۔

ان کی شاعری کو " اینگری ینگ مین " کی شاعری کہا جا سکتا ہے ۔ یہ غصیلا نوجوان سلف کی فرسودہ قدروں کو صرف شک کی نظر ہی سے نہیں دیکھتا، بلکہ ان کو پامال کرنے پر بھی آمادہ نظر آتا ہے ۔ نشتر کی شاعری ایک ایسے سفر کی داستان ہے، جو اوبڑ کھابڑ راستوں پر طے کیا جا رہا ہے ۔ راستے کی یہ ناہمواری اور سفر کی یہ صعوبت اس کا مقدر ہے ۔ ایسا مقدر جس کو وہ بدلنا چاہتا ہے اور نہیں بدل سکتا تو غصے اور جھنجھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتا ہے ۔ یہ غصیلا نوجوان بظاہر روایت سے بیزار ہے ؛ لیکن انسانی اقدار کا احترام اس بیزارگی کی تہہ میں کارفرما ہے ۔

نشتر نہایت پرگو شاعر ہیں اور کلام کی اشاعت کی رفتار بھی بہت تیز ہے ۔ اس افراط کا نتیجہ یہ ہے کہ رطب و یابس سب کچھ پختہ روشنائی میں آچکا ہے ۔ اگر وہ احتساب و انتخاب سے کام لیں تو ان کی شاعرانہ حیثیت کا صحیح تعین واضح طور سے ہو سکتا ہے ؛ جو ابھی تک نہیں ہوا ہے :

وہ شخص جس نے خود اپنا لہو پیا ہوگا	جیا تو ہوگا مگر کس طرح جیا ہوگا
سلگ رہی ہے مری روح جس کے شعلوں سے	کہیں وہ جسم اسی آگ میں نہ تپتا ہو
وہ ہوتے چپ تو ذرا دیر بولتے ہم بھی	ہیں کتنے پانی میں ان کو ٹٹولتے ہم بھی
میرے لبوں پہ کھیل رہی ہے وہی ہنسی	ہر چند ریت ریت ہوا ہوں چٹان سے

مرے چاروں طرف ہے بھیڑ، لیکن
میں اندر سے اکیلا ہو گیا ہوں

صبحِ خنداں کی تو اب دل سے تمنا بھی گئی
اب مقدر میں یہی شام گراں رہنے دو

میں کس کو یاد رکھوں اور بھول جاؤں کسے
دِوار ٹوٹ گئی، جس پہ اک کلنڈر تھا

عجیب کارِ ہوس ہے، نشاطِ وصل کے بعد
خود ایک ننھے سے بچے کو زندہ گاڑ دیا

مجھ کو بہلائے گی خوابوں کے کھلونے دے کر
اور پھر رات بھی چپ چاپ گزر جائیگی

کھلونا گھر میں بیٹھا رو رہا ہوں
تری ممتا کا چہرا ڈھونڈتا ہوں

بات کرنے کو بہت ہے دوستوں کا یہ ہجوم
ساتھ دینے کے لیے ان میں مگر کوئی نہیں

ہتھیلیوں میں چھپا لو کہ بجھنے والے ہیں
چراغ جاتی ہوئی شام کے حوالے ہیں

ہم تو جیتے ہیں اس طرح جیسے
ہم میں شامل نہیں خدا کوئی

پلک جھپکتی نہیں، دیکھ آئے وہ منظر
کسی کے دوار میں ہلکی سی اک دراڑ، دیا

بھیڑ میں راستہ نکالیں گے
پہلے جیسے نہیں بڑے ہیں لوگ

وہ بٹ گیا ہے تو پہچان کیسے ممکن ہو
ہر ایک چہرے کو اپنی نقاب دے کے گیا

تیری دہلیز پہ جلتا ہوا ننھا سا دیا
کیسے رکھ دوں، اسے پھونکوں سے بجھا دیگا کوئی

وضع کر لی جائیگی کوئی نئی تعزیر پھر
کچھ نہ پوچھا جائیگا ہم سے سزا دی جائیگی

کھڑا ہوں دوست یا دشمن ہوں میں تمھارے بیچ
تو خود کو دیکھ لو درپن ہوں میں تمھارے بیچ

اپنے لٹنے کا بھی احساس نہیں ہے مجھکو
جانے کیا میں نے ان آنکھوں میں خزانے دیکھے

ظہیر حیدری : ——— ظہیر الحسن حیدری

ان کے والد کا نام الطاف حسین ہے۔ ۱۲ مئی، ۱۹۴۲ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے۔ شعر و شاعری کا شوق بچپن سے دامن گیر ہے۔ اثر کریمی اور نظر رشیدی سے مشورۂ سخن کرتے ہیں۔ شاعری کے قدیم و جدید رجحانات سے خاصی آگہی

رکھتے ہیں۔ شعر سازی کا سلیقہ بھی ہے اور شعر فہمی کا بہرہ بھی۔

ماہنامہ روبی دہلی کے منعقدہ غزل انعامی مقابلے (۱۹۷۳ء) کے لیے طرحی غزل لکھ کر انعام حاصل کر چکے ہیں۔ اس انعامی غزل کے دو شعر یہ ہیں:

سوچنا ہے عبث فلسفی کی طرح — وقت بہتا رہیگا ندی کی طرح

کل جنھیں اپنا سایہ سمجھتے تھے ہم — آج ملتے ہیں وہ اجنبی کی طرح

دیگر منتخب اشعار:

اپنی شہرت کا ہے احساس سبھی کو لیکن — غیر کے واسطے ہو کر کوئی رسوا دیکھے

افکار کے فانوس کو بجھنے نہیں دیتے — رہتے ہیں اندھیروں میں اُجالوں کی طرح ہم

کس طرح ہمیں لوگ فراموش کرینگے — ملتے ہیں کتابوں میں حوالوں کی طرح ہم

مآلِ گردشِ ایام دیکھ اے دنیا — ہر انقلاب کی ٹھوکر میں کاسۂ سر ہے

جانتی ہے تابیِ دل کا جو حال — اپنے بستر پر تڑپتی چاندنی سے

ایک در تجھ پہ ہو بند تو مایوس نہ ہو — دیکھنا سیکڑوں کھل جائینگے در آپ سے آپ

راہِ عام پر چلنا، ناپسند ہے ہم کو
آپ تک پہنچنے کے اور بھی تو رستے ہیں

اقبال اشہر : ——— اقبال احمد قریشی

کامٹی کے ابھرتے ہوئے اور نوجوان شاعروں میں اقبال اشہر کا نام سب سے نمایاں ہے۔ اقبال احمد قریشی سے اقبال اشہر تک کی جست ان کی انفرادیت پسندی اور خود شناسی کا پتہ دیتی ہے۔

تاریخِ پیدائش ۱۵ مارچ ۱۹۵۰ء، لہٰذا عمر بتیس برس۔ صرف آتش ہی نہیں ان کی شاعری بھی جوان ہے۔ لیکن اس جوانی میں رومانیت کے ساتھ ادراکِ حقیقت بھی کارگر و کارساز ہے۔ یہ بات ہمارے کم جوانوں کو نصیب ہے۔ اشہر کسی مخصوص مکتبۂ شعر سے وابستہ نہیں ہیں۔ ہاں جدیدیت کے رجحان سے

متاثر ضرور ہیں ۔ وہ اپنے ذاتی احساسات و تجربات کو شعر کے سانچے میں ڈھالنا جانتے ہیں ۔ لفظیات کے سلسلے میں ان کی آزادگی احتیاط کا دامن نہیں چھوڑتی ۔ لب و لہجے میں نرمی کے ساتھ طنز و تمسخر کی گھلاوٹ ہے ۔ ان کے اندر کا کھلنڈرا لیکن سوچتا اور جلتا ہوا ذہن رکھنے والا نوجوان بار بار ان کے شعروں میں جھلکتا ہے ۔ یہ سوچتا اور جلتا ذہن سنجیدگی اور شعر گوئی کو اپنا شعار بنالے تو مستقبل نہایت تابناک ہوگا :

یہ بے ہنری بھی نہیں ساتھ بھی نہیں دیتے
نہ جانے ہے مرے ہاتھوں کو بیر کیا مجھ سے

میں ٹوٹنے کے تصور سے خوف کھاتا ہوں
لپٹ نہ جائے کہیں میرے نقشِ پا مجھ سے

خود اپنا عکس دیکھ کے چکرا گیا ہوں میں
آئینہ دیکھنا بھی کڑا امتحان ہے

اک بار چوم لوں در و دیوار تو چلوں
جیسا بھی ہے یہ میرا پرانا مکان ہے

یہ کج ادائی بہت کم نصیب ہوتی ہے
تم اپنے غم میں اکیلے ہو پھر بھی سب تک ہو

جو لوگ لوٹ کے خود میرے پاس آئے ہیں
وہ پوچھتے ہیں کہ اشہر ہیں یہ اب تک ہو

خزاں کا قرض تو اک درخت پر ہے یہاں
یہ اور بات کہ ہر شاخ بارور ہے یہاں

ستا! آج مناسب جگہ یہ بارش نے
اسی بہانے ٹھہر جاؤ اس کا گھر ہے یہاں

فی الحال تو زمیں پہ ہے اس بات کو نہ بھول
معلوم ہے تری بہت اونچی اڑان ہے

روشنی مجھ کو ملی ہے تو ذرا جانچ بھی لوں
آج کچھ چہرے نقابوں سے نکل آئے ہیں

کیوں جلاتا ہے یہ صحرا مجھے معلوم ہے سب
اپنے دامن کو مری راکھ سے بھر لینا ہے

میں جانتا ہوں زہر پیالے میں ہے مگر
وہ دردِ تشنگی ہے کہ توبہ نہ کر سکوں

شعر کہنے سے بھلا کیا ہوگا
آؤ اشعر کہیں تقریر کریں

عارف : ـــــــ عبدالباری

کامٹی کی ممتاز شخصیتوں میں حافظ محمد داؤد بھی شامل ہیں ۔ وہ مومن برادری

کے سردار تھے۔ اپنے وقت کے ایک صاحبِ علم اور صاحبِ بصیرت بزرگ تھے۔ حلیم الطبع، مہمان نواز اور با اخلاق تھے۔ انھیں علمی و دینی کاموں سے گہرا شغف تھا۔ مدرسہ سراج المومنین کامٹی کے بانیوں میں تھے۔ انھوں نے یکم جون ۱۹۳۵ء کو رحلت کی۔ یہی مشہور بزرگ عارف کے پردادا ہیں۔

ان کے دادا کا نام حاجی جمال الدین داؤدی (ف : ۱۹۷۱ء) اور والد کا نام عبدالحفیظ ہے۔ عبدالحفیظ اگرچہ شاعر نہیں ہیں؛ لیکن سخن فہم ضرور ہیں۔ انھیں سیکڑوں اشعار زبانی یاد ہیں۔

عارف یکم مارچ ۱۹۵۲ء کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اردو میونسپل پرائمری اسکول، اسمٰعیل پورہ، کامٹی سے حاصل کی۔ مالی بدحالی کی وجہ سے مزید تعلیم حاصل نہ کر سکے۔ اس کمی کو ذاتی مطالعے سے پورا کیا۔ ان کی شعر گوئی کا آغاز ۱۹۶۸ء میں ہوا۔ شاطر حکیمی کے شاگرد ہیں۔ چونکہ اتنی کم عمری میں وہ بہت عمدہ اور لطیف شعر کہتے ہیں، اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ قدرت نے انھیں شاعر بننے کی صلاحیت بدرجۂ اتم ودیعت کی ہے۔ جدید لہجے میں انھوں نے جو غزلیں کہی ہیں، وہ ان کے روشن مستقبل کا پتا دیتی ہیں۔

چند شعر دیکھیے :

چہرے بدل گئے ہیں کہ میں ہی بدل گیا
اپنے ہی شہر میں نہ ملا آشنا مجھے

میری خاطر کسی معصوم کے لب ہلتے ہیں
کون کرتا ہے دعا، اہلِ ہوس کیا جانیں

جب لڑیں گے اہلِ دانش اپنی اپنی آن پر
تب خرد کو راستہ دکھلائیگا میرا جنوں

ہر چند نہ راس آئیں اپنوں کی ملاقاتیں
تم دور نہ ہونے دو چہرے سے بشاشت بھی

کھل گئے جتنے رموزِ کائنات
اتنی الجھن میں پڑی انساں کی ذات

میں راہِ وفا کا اک دنی سا مسافر ہوں
مجھ کو نہ تھکا پائی صدیوں کی مسافت بھی

مشکوک ہو رہی ہے مری شخصیت عبث
میری نظر سے کاش کوئی دیکھتا مجھے

ہوتی نہیں ہے گرم ہوا یوں ہی بے سبب
کوئی علاقہ شہر کا جلتا نہ ہو کہیں

اس کو بھاتی نہیں اداکاری　　　تبصرے میں کھرا ہے آئینہ
سورج چڑھا تو ہر کوئی تعظیم کو جھکا
عارف کھڑا ہے تن کے تماشا نہ ہو کہیں

ماحصل:

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر زمانے میں اردو شاعروں کی بہتات رہی ہے۔ (اس کا جواز استاد شاگردی کی روایت میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔) اور ہماری ادبی تاریخ ان سب کے نام اور کلام کو اپنے سینے میں محفوظ رکھنے سے قاصر رہی ہے۔ اس کا واضح ترین سبب تو یہی ہے کہ ہر دور میں غالب تعداد ایسے شاعروں کی رہی ہے؛ جنھوں نے حصولِ شہرت کے آسان اور سستے وسیلے کے طور پر اس شریف فن کو اپنایا اور در حقیقت اسے رسوا کر دیا۔ ان کا کلام شاعرانہ صداقت اور خلوص سے عاری ہوتا ہے؛ اس لیے اپنی فطری موت مر جاتا ہے۔ ہاں کچھ شاعر ایسے بدنصیب بھی ہوتے ہیں، جو اپنی تاثیر اور توانائی کے باوصف دستبردِ زمانہ اور انقلابِ دہر کا شکار ہو کر گوشۂ گم نامی میں چھپ جاتے ہیں اور تاریخِ ادب میں اپنا صحیح اور مناسب مقام پانے سے محروم رہتے ہیں۔
گستاخی معاف! ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ متشاعروں کی شناخت اور ان کی نشاندہی ایک مشکل، صبر آزما اور پریشان کن ادبی اور سماجی مسئلہ ہے۔ اس کتاب کی تالیف و تدوین کے درمیان اس مسئلے نے ہم کو خاصا پریشان رکھا ہے۔ بہر کیف ہم نے مقدور بھر اس بات کی کوشش کی ہے کہ زندہ شاعروں میں سے کوئی اہم، سچا یا اچھا شاعر چھوٹنے نہ پائے، تاہم کچھ نام چھوٹ گئے ہوں تو ہمیں معذور سمجھا جائے۔ ان کے علاوہ متعدد

نو آموز اور نو وارد شعرا اپنے اپنے علم و استطاعت کے مطابق شعر گوئی میں مصروف ہیں؛ جن کی فہرست سازی بے سُود ہے۔

متوفی شعرا میں؛ جن بزرگوں کا کلام تلاش و جستجو سے حاصل ہوا ہے؛ ان میں سے اکثر کے حالات تو ہمیں مل گئے۔ لیکن افسوس کہ محمد عبدالرحمن انور، عبدالشکور شریف، عبدالرحمن رحمن، محمد بشیر نادان، محمد یحیٰ یحیٰ، محمد اسمٰعیل راقم، محمد عمر آتش، عبدالباری ارمان، محمد اسد اللہ راحت، شیخ کریم بخش عادل، میر سید احمد زیبا، قادر شریف حقر، دین محمد ارمان، محمد عبدالحفیظ آتش اور محمد حبیب اللہ انور وغیرہم کے حالات اب تک پردہ خفا میں ہیں؛ اس لیے ان کے متعلق مجبوراً خاموشی اختیار کرنی پڑی۔

ہم نے متوفی اور زندہ شاعروں کے حالات قلم بند کرنے میں یہ نکتہ ملحوظ رکھا ہے کہ ان کی زندگی کے اہم حالات و واقعات سامنے آجائیں اور جو شاعر جس مقام اور مرتبے کا حامل ہے؛ اس پر اتنی ہی توجہ صرف کی جائے۔ چنانچہ بعض کے تذکرے تفصیلی اور بعض کے اجمالی ہو گئے ہیں۔

ادبی اور فنی لحاظ سے کامٹی کے نمائندہ شاعروں کا کلام بہت جاندار، توانا، دل کش اور موثر ہے۔ سعید اور ان کے تلامذہ کے یہاں خارجی مضامین کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کا لطف اور فنی پختگی بھی نظر آتی ہے۔ موضوع کے اعتبار سے ان شعرا کا کلام دبستانِ لکھنؤ کی خوشہ چینی کرتا ہے۔ البتہ سعید کے ایک شاگرد مولانا انور کے کلام میں داخلی مضامین کی کثرت اور متانت و سنجیدگی ملتی ہے۔ یہی اوصاف ان کے تلامذہ کے کلام میں بھی موجود ہے۔

کامٹی کی عصری شاعری کا بہ نظر انصاف جائزہ لیا جائے تو اس حقیقت کو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ سوز خضرائی وہ پہلے شاعر ہیں؛ جن کے کلام میں خالص تغزل کے علاوہ حیات و کائنات کے مسائل، جدید رجحانات نیز ترقی پسند ادب

کے اوصاف بدرجۂ احسن موجود ہیں ۔ اس علاقے کے شعرا کے ذہن و فکر میں
تبدیلی لانے میں ان کی شاعری نے ایک اہم اور قابلِ تعریف کردار ادا کیا ہے ۔
شاطر حکیمی کا کلام بھی اس خصوصیت سے عاری نہیں ؛ تاہم تفکّر و تعقّل کی
کمی نے ان کی شعری افادیت اور اہمیت کو متاثر کیا ہے ۔
اسی دور کے ایک اور شاعر نظر رشیدی کا اندازِ فکر اور لب و لہجہ سب سے
انوکھا اور انفرادی ہے ۔ ان کے کلام میں وہ قوت ہے ' جو ادب میں صحیح
مقام دلانے کی ضامن ہوتی ہے ۔ یہی حال مدحت الاختر کی شاعری کا ہے ۔
کامٹی کے موجودہ شاعروں میں یہ تین نام : سوز خضرائی ، نظر رشیدی اور
مدحت الاختر اس قابل ہیں کہ اہلِ کامٹی بجا طور پر ان پر فخر کر سکتے ہیں ۔

نثری ادب ـــــ ایک جائزہ

کامٹی میں نثر نگاری کی ابتدا بیسویں صدی کے اوائل میں ہوتی ہے۔ صوفی عبدالحکیم پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے ہدایت الطالبین کے عنوان سے ۱۳۳۲ھ (۱۹۱۳ء) میں اردو میں ایک رسالہ لکھا، جو ۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ یہ غیر مطبوعہ حالت میں ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے۔ اس کا سائز ۸ × ۱۲ ہے اور اس میں مسئلہ توحید، تنزلاتِ ستہ، احکام تصوف، مبداء معاد، ذکر و شغلِ عروج و نزول مسلکِ اہلِ سلوک، کیفیتِ رُوح اور حقیقتِ نفس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب کے آخر میں تجمل جلالپوری کا قطعۂ تاریخِ تصنیف بھی درج ہے، جس کا آخری شعر ہے:

جو فکرِ تاریخِ سالِ ہجری تمھیں تجمل ہے صاف کہدو
"پسند آفاق و راہبر کیا ہدایت الطالبین ہوئی ہے" ۱۳۳۲ھ

کتاب کی ابتدا میں مصنف نے اس رسالے کی غرض و غایت اس طرح بیان کی ہے:

گزارش کرتا ہے خاکسار، ذرۂ بے مقدار، عبدالحکیم مجیبی قادری کہ ایک ادنا خادم ہے؛ حضرت قدسی صفات، عین العرفا، مسیح الاولیا، عین المعروف، معروف العین

حضرتِ مجیب الحق والدین مولانا مرشدنا شاہ طالب حسین حسینی فرخ آبادی قادری چشتی قدس اللہ سرہٗ کا :

نہ تو مجذوب میں دیکھا ، نہ کسی سالک میں
جو جھلک دیکھی ہے ساقی ترے پیمانے میں

اگرچہ یہ احقر العباد ، کسی قابل اور لائق نہ تھا ؛ لیکن جناب پیر و مرشدِ برحق حضرت مولانا مرشدنا کی نظرِ الطاف اور توجہ خداوندی نے حقائقِ سلوک اور کیفیتِ مجاہدہ سے واقف اور خبردار کیا :

از سلوکِ ذاتِ تو اظہارِ حق	وز بیانت می کند گلزارِ حق
اے رخت ، عکسِ جمالِ احدیت	می نماید در دلم دیدارِ حق
از تعین وارہاند چشمِ ناز	فاش می گویم سرِ بازارِ حق
از صفاتِ ذاتِ او حق جلوہ گر	از توجہ شعلہ زن شد نارِ حق
اندرونِ سینہ جاں بیند حکیم	روئے طالب مظہرِ انوارِ حق

۱۲۹۲ھ میں شرفِ عزت ، ارادتِ بیعت سے حاصل کی اور ۱۳۰۱ھ تک حضوری میں حاضر ہوتا رہا ۔ بعدہٗ اجازت سلسلۂ قادریۂ عالیہ کی دے کر فدوی کو رخصت فرمایا ۔ بعدہٗ ۱۳۰۵ھ میں اور ۱۳۰۷ھ میں طلب فرمایا اور مکرر پند و نصیحت فرمائی اور سلاسل خاندانِ چشتیہ ، قدوسیہ ، شطاریہ ، نقشبندیہ ، سہروردیہ کی اجازت و خلافت عطا فرمائی .... پھر موقع حضوری کا حاصل نہ ہوا ۔ عرصے سے ناگپور کامٹی میں ہوں اور باعثِ تالیف اس رسالے کا یہ ہے کہ چند احباب ، صادق الاعتقاد نے یہ فرمائش کی کہ کوئی رسالہ جس میں

ذکرِ مسئلہ توحید، وحدت الوجود، تنزلاتِ ستۃ اور احکام تصوف
مبدا معاد اور ذکر و شغلِ عروج و نزول اور مسلک اہلِ سلوک
اور کیفیت روح اور حقیقت نفس کی ہو، تحریر فرمائیے۔
اگرچہ یہ فدوی لیاقتِ علمی اور حقائقِ تصوف سے بے بہرہ
ہے، لاچار ہوکر ...... چند کتب مشہور خصوصاً فصوص
الحکم اور فتوحاتِ مکیہ، شیخ محی الدین ابن عربی قدس اللہ
سرہٗ سے اور جواہر الحقائق، شاہ سید محی الدین ویلوری
قدس اللہ سے اور لمعات، مولانا فخر الدین عراقی قدس اللہ
سرہٗ سے اور لوائح، مولانا عبد الرحمٰن جامی قدس اللہ
سرہٗ سے اور حقائق نما (شرحِ جامِ جہاں نما) شیخ ابراہیم
شطاری قدس اللہ سرہٗ سے اور تنزلاتِ ستۃ، مولانا بحر
العلوم عبد العلی قدس اللہ سرہٗ سے اور ادلات التوحید،
شیخ علی ماہمی قدس اللہ سرہٗ سے اور تحفۃ المرسلہ، شیخ
فضل اللہ برہانپوری قدس اللہ سرہٗ سے اور نورِ مطلق (شرح
کلمۃ الحق) مولانا شاہ سید عبد الرحمٰن لکھنوی قدس اللہ سرہٗ
سے اخذ کر کے ایک رسالہ ہدایت الطالبین لکھا ....

اس رسالے میں چار باب اور خاتمہ ہے۔

صوفی عبد الحکیم کے بعد محمد طالب الدین طالب کی مطبوعہ اردو نثر دار المعلومات مودی کامٹی کی سالانہ رپورٹ کی شکل میں فراہم ہوئی ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں نثر نگاری کی اچھی خاصی صلاحیت موجود تھی۔ یہ رپورٹ ۱۹۲۴ء میں انجمن پریس ناگپور سے ۶ × ۱۰ سائز کے ۲۴ صفحات پر چھپی ہے۔ اس میں انجمن کے اغراض و مقاصد اور کارگزاریوں پر روشنی ڈالتے ہوئے،

اشاعتِ علم کی اہمیت اور اردو زبان کی اصلاح و ترقی سے بھی عالمانہ بحث کی گئی ہے ۔ ایک جگہ لکھتے ہیں :

آج مغرب کو نہ صرف زر و قوت کے اعتبار سے مشرق پر فوقیت حاصل ہے، نہ صرف اس کے خزانے سیم و زر سے بھرے پڑے ہیں، بلکہ اس کے قومی خزانے علمی جواہر سے بھی لبریز ہیں ۔ آج وہاں متعدد کتب خانے ایسے موجود ہیں، جن کی تعدادِ کتب لاکھوں سے متجاوز ہے۔ پھر بھی جویانِ علم اس طرح سرگرم عمل ہیں گویا انھیں ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے ۔ کیا یہ ان کے تفوق اور بیدار مغزی کا زندہ ثبوت نہیں ۔

اس سلسلے میں مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے مایۂ ناز کارناموں کو یاد دلانے سے سوائے پرانے زخموں کو تازہ کرنے کے اور کچھ حاصل نہیں ۔ ایک دن وہ تھا جبکہ قرطبہ کے مشہور کتب خانے میں چھ لاکھ مجلد کتابیں موجود تھیں، جن کی فہرست کتب چونسٹھ جلدوں میں بھی ناتمام رہ گئی تھی اور آج وہ تہی دامن ہے، جس کا دردناک افسانہ بجائے الفاظ کے اشکوں کا سیلاب زیادہ فصاحت سے بیان کر سکتا ہے ۔

اس دور میں عبدالستار فاروقی نے اپنی نثر نگاری کی ابتدا افسانہ نویسی سے کی ۔ ان کا پہلا افسانہ " آہ تم کہاں ہو " زاہد القادری کی ادارت میں نکلنے والے ماہنامہ " الہلال " (دہلی) میں دسمبر ۱۹۲۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کے بعد ان کے چند افسانے ان کے ذاتی اخبار الفاروق اور عالمگیر لاہور میں شائع ہوئے ؛ جن میں ٹولی گردی (مطبوعہ عالمگیر) کو کافی

مقبولیت ملی ۔

افسانوں کے علاوہ انھوں نے تحقیقی، تنقیدی اور سماجی موضوعات پر بھی کئی مضامین لکھے ہیں، جو ملک کے مؤقر جرائد و رسائل میں چھپ چکے ہیں ۔ اخبار امید اور الفاروق، جس کے وہ مدیر تھے ؛ ان کی نثری تخلیقات سے پُر ہیں ۔ وہ ان پرچوں میں ہر ہفتے حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے اور ملی و قومی مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کیا کرتے تھے ۔ ان کے تحریر کردہ اداریے انتہائی جاندار اور پُر زور ہوا کرتے تھے ۔

انھوں نے تین انگریزی کتابوں کے ترجمے بھی کیے تھے ۔ ان میں سے ایک کتاب "اسلامی ادبیات پر ایران کا اثر"، جون ۱۹۷۴ء میں نظامی پریس وکٹوریہ اسٹریٹ لکھنؤ سے ۱۰۴ صفحات پر چھپ چکی ہے ۔ اس کتاب پر ناشر کی حیثیت سے مکتبہ الفاروق نیا بازار کامٹی کا نام درج ہے ۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قاضی اطہر مبارکپوری لکھتے ہیں :

> یہ کتاب درحقیقت تین مضامین یا کتابوں کا مجموعہ ہے ۔ روسی عالم اسٹرانز کا' اس موضوع پر کتابچہ' پارسی عالم جی کے زیمان کا' اس کا انگریزی ترجمہ اور مقدمہ و اضافہ اور جناب عبدالستار صاحب فاروقی کے بسیط مقدمے کے ساتھ ان دونوں کا اردو میں ترجمہ ۔ اس طرح یہ کتاب اپنے موضوع پر تفصیلی معلومات کی حامل بن گئی ہے ۔ فاروقی صاحب اردو کے کہنہ مشق صحافی اور محقق ہیں ۔ ان کے علمی اور تحقیقی مقالات ایک زمانے میں شائع ہوا کرتے تھے ۔ اس لیے ان کی تحریر میں پختگی اور سنجیدگی ہے اور ترجمہ پر اصل کا گمان ہوتا ہے روسی مصنف نے ایران کی ساسانی سلطنت اور مجوسی سلطنت کی تاریخ کے ماخذ کے طور پر مسلم عہد کی تصانیف اور ساسانی

روزنامہ انقلاب، بمبئی ۔ ۱۱ اگست ۱۹۷۶ء

"مجوسی یادگاروں کی نشان دہی کی ہے اور اسی نقطۂ نظر سے
جی کے نریمان نے اپنے مختصر مقدمہ اور ضمیمہ کے ساتھ اس کا
ترجمہ کیا تھا اور فاروقی صاحب نے ان دونوں کا ترجمہ
کر کے اور تقریباً اسی کے برابر مقدمہ لکھ کر مستقل کتاب
تیار کی ہے ؛ جو کتاب کے صفحہ ۱۰ سے ۸۳ تک پھیلا ہوا
ہے ۔ اور ۲۲ عنوانات کے تحت ایران اور ایرانیت
سے متعلق معلومات جمع کی گئی ہیں ؛ جن کا ماخذ فارسی،
اردو اور مستشرقین کی کتابیں ہیں ۔ اس کتاب کے پورے
مندرجات سے اتفاق ضروری نہیں ہے بلکہ اختلاف
کی گنجائش ہے ، مگر یہاں اس کا موقع نہیں ہے ......
اس کے باوجود کتاب اپنے موضوع پر بہت دلچسپ اور
معلوماتی ہے ۔"[1]

عبدالستار فاروقی، کامٹی کے وہ واحد نثر نگار ہیں، جنھوں نے مستقل
مزاجی سے تقریباً پچاس سال تک نثر نگاری کی ہے اور اس میدان میں
کئی مفید اور معیاری مضامین چھوڑے ہیں ۔ اگر ان کو یک جا کر کے
شائع کر دیا جائے تو یہ نہ صرف ان کا بلکہ اردو ادب کا حق بھی ادا ہو گا ۔
علمی اور تحقیقی لحاظ سے ان کی ہستی قابلِ احترام ہے اور انھوں نے
جو کچھ لکھا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ ہماری علمی و ادبی تاریخ کا بیش
بہا حصہ ہے ۔ ان کا طرزِ تحریر دلچسپ، عام فہم اور موثر ہے ۔ اندازِ
بیان میں دلکشی پائی جاتی ہے ؛ زبان مرصع اور پرکار ہے ۔ مثلاً
یہ عبارت دیکھیے :

"سرزمینِ بے آب و گیاہ، حجاز میں ایک شہر مکہ تھا اور جو

---

۱ ۔ اسلامی ادبیات پر ایران کا اثر ۔ ص : ۲۰

آج بھی بفضلِ خدا قلبِ عالم پر سایہ گستر اور مسلمانانِ عالم کا ملجا و ماوا بنا ہوا، دنیا کے نقشے میں نگینے کی طرح جڑا ہوا موجود ہے۔ اس شہرِ مکہ میں خدائے قدوس نے اپنا ایک منادی بھیجا، جو اس شہر کے ایک قبیلے قریش کا درِ یتیم اُمی تھا۔ جس کا نام نامی اسم گرامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھا۔ حجاز والے جہالت اور ضلالت کے گڑھوں میں منھ کے بل پڑے تھے۔ اس اُمی کی آواز نے ان کی روحوں کو جھونکا دیا اور وہ آواز کیا تھی: اللہ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں محمد اس کے بندے اور رسول ہیں۔ اس آواز نے سحر کا کام کیا اور عرب کے بادیہ نشیں شتربان ایک قلیل عرصے میں جہاں دار و جہاں بان بن گئے۔ مشرق اور مغرب کی بساطِ سیاست پلٹ گئی۔ علم و یقین کا آفتاب بلند ہوا، تاریکیاں چھٹنے لگیں اور صراطِ مستقیم روشن۔ دوربین اور دقیقہ رس نظروں نے دیکھا کہ فارس کے آتش کدوں کی آگ سرد ہو گئی ہے اور قیصر و کسریٰ کے محلوں کے کنگورے ٹوٹ گئے ہیں۔

جب کامٹی سے ۱۹۲۵ء میں سہ روزہ جمہور، ماہنامہ درِ سخن اور ہفتہ وار الفاروق شائع ہوا تو یہاں کی ادبی دنیا میں ایک نئی لہر دوڑ گئی اور شعرا کے ساتھ ساتھ کئی چھوٹے بڑے نثر نگار بھی ابھرے۔ ان میں مولانا محمد عمر انصاری اطہر، محمد ظہیر وارثی، حمید جمال، فیض انصاری اور ریاض رؤفی کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا محمد عمر انصاری اطہر کی نثر نگاری کی ابتدا ان کے ذاتی پرچے جمہور اور درِ سخن کے اجرا کے ساتھ ہوئی۔ ان پرچوں میں ان کے تحریر کردہ اداریے

اور خبروں کے علاوہ دو مضامین شمس ولی اللہ (درسخن مارچ ۱۹۳۵ء)
اور زمانۂ جاہلیت کی عربی شاعری کا ایک ورق (درِ سخن اپریل ۱۹۳۵ء)
بھی چھپے ہیں ۔ الفاروق میں بھی ان کی کچھ نثری تخلیقات چھپی ہیں ۔
سماجی اور معاشی موضوع پر ان کا ایک کتابچہ انکشاف ۱۹۳۷ء میں
الفاروق پریس کامٹی سے شائع ہوا ہے ۔ اگرچہ اطہر ایک اچھے نثر نگار تھے
لیکن افسوس کہ انھوں نے کوئی مستقل کارنامہ اپنے پیچھے نہیں چھوڑا ہے ۔
بس چند مضامین اور ایک کتابچہ ہی ان کو نثر نگار کی حیثیت سے متعارف
کرانے کا فریضہ انجام دیتا ہے ۔

اسی سال (۱۹۳۷ء) محمد نورالحسن صادق کی ۳۲ صفحات کی ایک مختصر
کتاب الفاروق پریس سے شائع ہوئی ۔ اس کتاب میں انھوں نے
مومن برادری کو چند نصیحت آمیز باتیں بتائی ہیں ۔ اور ان کے معاشرتی
نظام " چوراسی " کی اصلاح و درستگی کے لیے مفید مشورے دئے ہیں ۔
کتاب کی ابتدا میں محمد ظہیر وارثی کا پانچ صفحات پر مشتمل دیباچہ ہے ۔
محمد ظہیر وارثی کے چند ادبی مضامین روزنامہ وطن دہلی ، نیا زمانہ الہ آباد
روزنامہ خلافت بمبئی اور الفاروق میں شائع ہوئے ہیں ۔ علاوہ ازیں
ان کے تین طویل مضامین : مسجد وارث پورہ کامٹی کی تاریخ ، کامٹی کی
مختصر تاریخ اور کامٹی کی علمی و ادبی سرگرمیوں کی تاریخ بھی چھپ
چکے ہیں ۔ پہلا مضمون ۱۹۴۶ء میں مسجد کی سالانہ رپورٹ کے ساتھ
الفاروق پریس سے شائع ہوا ۔ اس میں انھوں نے کامٹی میں مومن
برادری کی آمد اور ان کی معاشرتی و تمدنی حالت پر روشنی ڈالتے
ہوئے مسجد کی تاریخ لکھی ہے ۔ دوسرا مضمون جو ڈیمائی سائز کے
۳۹ صفحات پر مشتمل ہے ، مدرسہ سراج المومنین وارث پورہ ، کامٹی
کی پانچ سالہ رپورٹ (۷۳ - ۱۹۷۷ء) میں شامل ہے ۔ تیسرا فل اسکیپ

کے ۱۰ صفحات پر مشتمل ہے اور انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری کامٹی کی مطبوعہ رپورٹ (مجلۂ علم و عرفان ۱۹۸۰ء) میں درج ہے۔ یہ تینوں مضامین کامٹی کی تاریخ کے سلسلے میں انتہائی اہم اور معلوماتی ہیں۔

حمید جمال کی نثر نگاری چند مضامین اور افسانے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ان کا ایک افسانہ سرو چراغاں' خیال (مارچ ۱۹۵۹ء) میں چھپا ہے۔ ولیم شکسپیئر کے متعلق ایک مختصر مضمون درِ سخن (اپریل ۱۹۳۵ء) میں شائع ہوا ہے اور مولانا ناطق گلاؤٹھوی پر ایک مضمون ماہنامہ آجکل دہلی (اکتوبر ۱۹۵۷ء) میں ملتا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے چند ہلکے پھلکے مضامین مقامی پرچوں اور سوونیروں میں نظر آتے ہیں۔ انھوں نے ایک ناولٹ عالم پناہ اور طویل مقالہ اردو شاعری کا ارتقا بھی لکھا ہے جو غیر مطبوعہ حالت میں ان کے ورثا کے پاس محفوظ ہے۔ حمید جمال کی نثر انتہائی صاف و شستہ ہے۔ ان میں نثر نگاری کی اچھی خاصی صلاحیت موجود تھی۔ اگر وہ مستقل مزاجی سے اس طرف توجہ دیتے تو اس میں شک نہیں کہ انھیں کافی مقبولیت حاصل ہو جاتی۔

فیض انصاری نے نثر نگاری میں اپنی پوری صلاحیت صرف کی ہے اور ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ ان کے افسانے اور تنقیدی مضامین ان کے ذاتی پرچے خیال کے علاوہ الفاروق' ماہنامہ چاند ناگپور اور ہند و پاک کے دیگر جرائد و رسائل میں امتیازی حیثیت سے شائع ہوئے ہیں۔ ان کی ایک تحقیقی تصنیف "سی پی کے موتی" کا کسی زمانے (۱۹۴۷ء) میں بڑا شہرہ تھا۔ اس کے متعلق جو اشتہار شائع ہوا تھا اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ کتاب لکھی جا چکی تھی اور شائع ہونے والی تھی۔ ہم نے اس کتاب کے سلسلے میں کافی تلاش و تحقیق کی۔ لیکن نہ تو ان کے خاندان میں اس کا مسودہ موجود ہے، اور نہ ہی کسی پرچے میں (خصوصاً خیال میں) اس کے اجزا شائع ہوئے ہیں اس لیے اب شک ہوتا ہے کہ شاید "سی پی کے موتی" ایک خواب تھا، جو شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکا۔

فیض انصاری کے ہم عمروں میں ریاض رؤفی کا نام بھی افسانہ نگار کی حیثیت سے مقبول ہوا ہے۔ ریاض رؤفی ربانی اسکول کے بانی شیخ حسین ربانی کے بھتیجے تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالخالق تھا۔ وہ ملک کی تقسیم کے بعد پاکستان میں جا بسے تھے، جہاں ۲۹ اکتوبر ۱۹۸۰ء کو رحلت فرمائی۔ ان کے کئی افسانے ماہنامہ ساقی، دہلی میں شائع ہوئے ہیں، جن میں تقسیم وطن کے المیے پر ان کا افسانہ "پل کے دونوں طرف" بہت مقبول ہوا۔ سی پی اردو اکاڈمی، ناگپور نے ۱۹۴۴ء میں ان کے سولہ منتخب افسانوں کے مجموعے "دوسرا کنارا" کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا، لیکن افسوس کہ وہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔ ریاض رؤفی کے افسانوں میں ترقی پسندی کی گہری چھاپ ملتی ہے۔

آزادی کے بعد جو نثر نگار ابھرے ہیں، ان میں عزیز قدوسی اور ریاض الرحمن شمس قابلِ لحاظ ہیں۔ عزیز قدوسی نے کئی افسانے اور مذہبی مضامین قلمبند کیے ہیں۔ ان کے افسانے ہفتہ وار انجام دہلی، ماہنامہ جمالستان دہلی، ماہنامہ مست قلندر لاہور، ہفتہ وار پیام مشرق دہلی میں چھپے ہیں۔ انھوں نے جمعہ کے خطبات بھی اردو میں تحریر کیے ہیں، جو غیر مطبوعہ کتابی صورت میں ان کے پاس محفوظ ہیں۔

شمس میں تنقید نگاری اور افسانہ نگاری کی اچھی خاصی صلاحیت ہے لیکن پچھلے کئی برسوں سے حالاتِ زمانہ کا شکار ہونے کے باعث وہ خاموش ہو گئے ہیں۔ ان کے افسانے اور مضامین ماہنامہ شفق ناگپور، الحمرا بھوپال، ماہنامہ جمالستان دہلی، ہفتہ وار الوارث بمبئی، ماہنامہ فلمی نقاد ناگپور، ہفتہ وار آفتاب راولپنڈی اور ہفتہ وار روشنی سری نگر میں شائع ہوئے ہیں۔ ان کے قریبی دوستوں میں ایک شیام سوشیل بھی تھے، جو پنجاب کے رہنے والے تھے اور کچھ عرصے کے لیے کامٹی میں آباد ہو

گئے تھے ۔ انھوں نے بھی کامٹی میں قیام کے دوران چند عمدہ افسانے تحریر کیے ہیں ۔

یہی وہ زمانہ تھا جب تبسم شفائی طنزیہ مضامین، افسانے، خاکے، جاسوسی ناول اور کہانی کے میدان میں ہمہ گیر سطح پر اپنا امیج بنا رہے تھے کہ عین شباب میں اللہ کو پیارے ہو گئے ۔ ان کی چند کہانیاں بیسویں صدی میں چھپی ہیں ۔ ان کا ایک جاسوسی ناول بھی کسی فرضی نام سے شائع ہوا ہے ۔

اس دور کے دیگر نثر نگاروں میں عثمان ناظر، شاطر حکیمی، خلیل ارمان، ظہیر افروز، صدیق اختر انصاری، نصیر عظیمی، عبدالوکیل عارف، اظہار فاروقی وغیرہم کی چیدہ چیدہ نثری تخلیقات بھی اخبارات و رسائل میں چھپی ہوئی نظر آتی ہیں ۔

نثر میں اس زمانے کا ایک قابلِ احترام کارنامہ آسان درسِ قرآن کی اشاعت ہے، جو تین حصوں میں شائع ہوا ہے ۔ اس کے مؤلف حافظ محمد یعقوب، امام مسجد نیا بازار کامٹی ہیں ۔ افسوس! ہمیں اس کا اوّل و دوّم حصہ فراہم نہ ہو سکا ۔ البتہ تیسرا حصہ ہمارے کتب خانے میں موجود ہے ۔ اس کتاب کو عبدالستار فاروقی نے، الفاروق بکڈپو کامٹی کے زیرِ اہتمام ۱۹۵۸ء میں اسرار کریمی پریس، الہ آباد سے چھپوایا ہے ۔ اس کتاب میں، جو ۸۰ صفحات پر مشتمل ہے، پارۂ عم کی سورۂ اعلیٰ سے سورۂ تطفیف تک کی تفسیر بیان کی گئی ہے ۔

حافظ محمد یعقوب ایک خدا رسیدہ اور نیک انسان تھے ۔ انھیں مذہبی علوم کا گہرا مطالعہ تھا ۔ ان کی مذکورہ کتاب کے مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نثر نگاری پر کامل دسترس رکھتے تھے ۔ ان کے اور بھی کئی چھوٹے چھوٹے مذہبی کتابچے چھپے ہیں ۔ مثلاً جدید خطبات رمضان المبارک، عیدین اور شوال وغیرہ ۔ ان کا وصال ۶۵ سال کی عمر میں ۹ اگست ۱۹۷۰ء کو کامٹی

میں ہوا۔

آزادی کے بعد ابھرنے والے نثر نگاروں میں خورشید نادر، محمد حفظ الرحمٰن اور ڈاکٹر نظیر رشیدی کے کچھ مضامین بھی مختلف پرچوں میں چھپ چکے ہیں۔
خورشید نادر فارسی میں ایم۔اے ہیں۔ اردو زبان و ادب کا اچھا ذوق رکھتے ہیں۔ وہ متعدد علمی و ادبی مضامین سپرد قلم کر چکے ہیں، جن میں سبک ہندی اور شیوۂ تسلیم و رضا چھپ چکے ہیں۔ ایک طنزیہ اور مزاحیہ آرٹیکل "ہندوستان میں نقّادوں کا ارتقا" ماہنامہ شگوفہ میں چھپ کر مقبولیت پا چکا ہے۔

محمد حفظ الرحمٰن (ولادت: یکم نومبر ۱۹۲۹ء) ربانی ہائی اسکول میں مدرّس ہیں۔ ادبی اور سماجی کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں اور ادب و شعر کا اعلا ذوق بھی رکھتے ہیں۔ تعلیمی موضوعات پر ان کے کئی مضامین المعلم (اورنگ آباد) میں شائع ہوئے ہیں۔

نظیر رشیدی (ولادت: ۱۶ اپریل ۱۹۳۷ء) نے طالبعلمی کے زمانے میں بچّوں کے لیے چند مضامین قلمبند کیے ہیں جو غنچہ بجنور، پھلواری کراچی، ہدایت لاہور میں چھپے ہیں۔ ادبی موضوعات پر دو مضامین (شاہ نامۂ ہند اور ناگپور یونیورسٹی میں اردو تحقیق) ہماری زبان دہلی میں شائع ہوئے ہیں۔ یہ بھی سماجی اور ادبی کاموں میں ہمیشہ مصروف نظر آتے ہیں۔
اسلامیہ ہائی اسکول مومن پورہ ناگپور میں درس و تدریس کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

۱۹۶۰ء سے اب تک جو نثر نگار سامنے آئے ہیں ان میں خلیل انجم، خلش قادری، مقتول وارثی، ڈاکٹر محمد یٰسین قدوسی، عبدالرحیم نشتر، قیصر واحدی، حفیظ حارث، مقبول وارثی، غازی شباب احمد، شکیل شاہجہاں، سلیم شیائی، اقبال احمد ناصر، حبیب الرحمٰن فاروقی، محمد رفیق اے ایس، محمد شریف روشن

سہیل اختر انصاری صدیقی اور امتیاز خالق کے اسمائے گرامی نمایاں نظر آتے ہیں۔
عبدالرحیم نشتر کی دو کتابیں چھپ چکی ہیں۔ بھوپال ایک خواب (۱۹۷۷ء) اور نور نژاد (۱۹۸۰ء)۔ اول الذکر دو دربھ میں افسانوی رپورتاژ کی پہلی کتاب ہے۔ ثانی الذکر میں ودربھ میں افسانہ نگاری کی پچاس سالہ تاریخ کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے اور نوجوان افسانہ نگاروں کی منی کہانیوں کا انتخاب بھی شامل ہے۔

حفیظ حارث منی کہانیاں اور مختصر افسانے بڑی چابکدستی سے لکھتے ہیں۔ ان کی تخلیقات پابندی سے اخبارات و رسائل میں شائع ہو رہی ہیں۔ ان میں سے بعض ادبی حلقوں میں کافی پسند کی گئی ہیں۔ گزشتہ چار پانچ سال میں مقبول وارثی کے چند اچھے ادبی مضامین انقلاب بمبئی، قومی راج بمبئی اور مقامی پرچوں میں چھپے ہیں۔

حبیب الرحمٰن فاروقی صرف عمدہ کاتب ہی نہیں، باصلاحیت نثر نگار بھی ہیں۔ ان کے مطبوعہ مضامین میں مہاراشٹر میں اردو (ہماری زبان دہلی) اہمیت کا حامل ہے۔

محمد رفیق اے ایس (ولادت : ۲۶ جون ۱۹۵۸ء) پوروال کالج کامٹی میں زیر تعلیم ہیں۔ اگرچہ سائنس کے طالبعلم ہیں، لیکن ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کے کئی چھوٹے چھوٹے مضامین انقلاب بمبئی، رقیب، اخوت اور معیارِ قوم دھولیہ میں چھپے ہیں۔ محمد شریف روشن (ولادت ۲۷ مارچ ۱۹۵۹ء) کے منی افسانے معیارِ قوم، انقلاب، اخوت اور رقیب میں شائع ہوئے ہیں۔

امتیاز خالق (ولادت : ۲۶ دسمبر ۱۹۶۱ء) ۱۹۷۷ء سے لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانے اور مزاحیہ انشائیے انقلاب بمبئی، نوجنا دہلی اور تعمیر ہریانہ میں چھپے ہیں۔ انھیں رپورتاژ نگاری سے گہری دلچسپی ہے۔ اردو اور انگریزی

دونوں زبانوں میں لکھتے ہیں۔

جب کامٹی میں جدید تعلیم کا رجحان قوی ہوگیا تو تخلیق و تنقید کے ساتھ طالبانِ علم و ادب نے تحقیق کے میدان میں بھی جستجو کا قدم رکھا اور ڈاکٹر آف فلاسفی کی اعلا سند کے حصول کی طرف متوجہ ہوئے۔ چنانچہ اردو اور فارسی زبان و ادب کے موضوعات پر تحقیقی مقالے لکھ کر جن اصحابِ ذوق و محنت نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کا شرف پایا ہے ان کے نام یہ ہیں:

محمد یوسف انصاری	۱۹۶۸ء	تلوک چند محروم؛ حیات اور کارنامے
نظیر رشیدی	۱۹۶۹ء	نیاز فتحپوری؛ حیات، شخصیت اور کارنامے
ارشد جمال	۱۹۷۷ء	شبلی نعمانی کی سیرت نگاری
عبدالرب عرفان	۱۹۷۹ء	نعمت خانِ عالی؛ شخصیت، فن اور کارنامے
مدحت الاختر	۱۹۷۹ء	نظیری نیشاپوری؛ حیات اور فن
طاہرہ بانو	۱۹۸۰ء	اردو غزل کا طویل ارتقائی سفر
محمد اصغر عثمانی	۱۹۸۱ء	مولوی غلام علی آزاد بلگرامی
جاوید احمد سعیدی	۱۹۸۱ء	صالحہ عابد حسین؛ حیات اور ادبی کارنامے
عبدالرحیم نشتر	۱۹۸۱ء	اردو ادب میں پیروڈی

اگر یہ مقالات تفحص و تنقیہ کے بعد کتابی صورت میں سامنے آئیں تو یقیناً کامٹی کی ادبی تاریخ میں ایک روشن باب کے اضافے کا موجب ہوں گے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ خود اصحابِ سند یا ادبی ادارے اس طرف سنجیدگی سے توجہ دیں۔

اوپر جن نثر نگاروں کا ذکر ہوا ہے، ان میں عبدالستار فاروقی، محمد ظہیر وارثی حمید جمال اور فیض انصاری اپنی شہرت اور خدمت کے لحاظ سے خاص اہمیت اور مقام کے مالک ہیں۔ لہٰذا ان کے حالات یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

عبدالستار فاروقی :

عبدالستار فاروقی کے دادا، مئو (اعظم گڑھ) سے نقلِ مکانی کر کے کامٹی میں آباد ہو گئے تھے۔ ان کے والد کا نام عبدالغفور (ف: ۱۹۳۰ء) تھا۔ عبدالغفور کے چار بیٹے تھے: محمد عبدالرحیم، عبدالستار فاروقی، عزیز الرحمٰن اور ریاض الرحمٰن۔ محمد عبدالرحیم ہیلتھ ڈپارٹمنٹ ناگپور میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ تھے۔ وہ آخری دم تک ربانی ہائی اسکول کامٹی کے سکریٹری اور رفرینڈس ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کامٹی کے صدر رہے۔ ان کا انتقال ۱۹۷۵ء میں ہوا۔ عزیز الرحمٰن، کول مائنس کامٹی میں ملازم تھے۔ فی الحال خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ریاض الرحمٰن ایجوکیشنل ڈپارٹمنٹ بھوپال میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ ہیں۔

عبدالستار فاروقی ۱۵ دسمبر ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی ابتدائی تعلیم کامٹی میں ہوئی۔ ثانوی تعلیم کے لیے انجمن ہائی اسکول ناگپور میں داخلہ لیا تھا۔ لیکن ابھی نویں جماعت میں تھے کہ تحریک عدم تعاون (۱۹۲۰ء) کا غلغلہ چاروں طرف بلند ہو گیا، جس سے متاثر ہو کر انھوں نے اسکول چھوڑ دیا۔ اب وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لینا چاہتے تھے، لیکن معاشی بدحالی کی وجہ سے اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس ناکامی کے بعد سیاسی میدان

میں عملی حصہ لینا شروع کردیا۔ اسی دور میں وہ خلافت کمیٹی کامٹی کے سکریٹری مقرر ہوئے اور آل انڈیا کانگریس کے سالانہ اجلاس میں، جو ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں منعقد ہوا تھا، بحیثیت والنٹیر شریک ہوئے۔ یہیں سے ان کی سیاسی دلچسپیاں روز بروز بڑھتی گئیں۔ انھوں نے کئی سیاسی تحریکات میں پُرجوش حصہ لیا ہے۔ جب مسلم لیگ عوامی تحریک بن کر ابھری تو، وہ اس کے حامی ہوگئے اور اس میں ایک سرگرم کارکن کی حیثیت سے خدمت انجام دی۔ اسی کے صلے میں ۱۹۴۶ء میں ایم ایل اے بھی منتخب ہوئے تھے۔ لیکن آزادی کے فوراً بعد ہی انھوں نے کانگریس سے اپنا رشتہ دوبارہ قائم کرلیا اور اخیر وقت تک اسی کی حمایت میں سرگرم عمل رہے۔

ان کی صحافتی زندگی کی ابتدا ۱۹۲۱ء میں دہلی میں ہوئی، یہاں انھوں نے چھ مہینے تک روزنامہ ریاست میں منظہر انصاری بی اے (آنرز) کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد ۱۹۲۱ء میں ناگپور سے ہفتہ وار امید جاری کیا، جو تقریباً ڈھائی سال تک ان کی ادارت میں نکلتا رہا۔ پھر ۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو کامٹی سے ہفتہ وار الفاروق جاری کیا، جو قبولیتِ عامّہ کے باعث ۲۷ سال تک وسطی ہند کا واحد ترجمان بنا رہا۔

تعلیمی اور سماجی لحاظ سے بھی ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے کامٹی میں جدید علوم کی ترویج و اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے۔ وہ ربانی ہائی اسکول کامٹی کے ۱۹۲۶ء میں سکریٹری بنائے گئے تھے۔ پھر ۱۹۵۹ء میں اس ادارے کے صدر منتخب ہوئے اور زندگی کے اخیر لمحات تک اسی منصب پر فائز رہے۔ اس کی ترقی کے لیے انھوں نے جو کوششیں کی ہیں، وہ لائقِ تحسین ہیں۔ اب یہی ادارہ جونیر کالج کی منزل پر ہے۔

انھوں نے ۱۹۲۱ء میں انجمن ضیاء الاسلام پبلک لائبریری قائم کی تھی۔ اس

کے بھی وہ ہمیشہ صدر رہے ۔ ان کا تعلق بنکر برادری سے تھا، لہٰذا اس
پسماندہ طبقے کی مالی حالت کو بہتر بنانے کے لیے ۱۹۴۴ء میں کامٹی ویورس
کوآپریٹیو سوسائٹی کی بنیاد ڈالی ۔ انھوں نے بنکروں کی ایک یونین بھی قائم
کرکے اس کے ذریعے حکومت سے کئی مراعات حاصل کیں ۔ ڈاکٹر ایچ ایم شیخ
کالونی کامٹی انھیں کی کوششوں کا نتیجہ ہے ۔ وہ انجمن ترقیِ اردو (شاخ
مدھیہ پردیش) کے صدر بھی رہ چکے ہیں ۔ حکومتِ مہاراشٹر نے انھیں ودربھ
سنٹرل ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا ۔ غرض ان کی پوری
زندگی، سیاسی، سماجی، صحافتی، علمی اور ادبی کاموں میں گزری ۔ کبرسنی کے
باعث، ۱۵ دسمبر ۱۹۷۷ء (۳ محرم ۱۳۹۸ھ) کو انتقال ہوا ۔ مسلم قبرستان
کامٹی میں مدفون ہیں ۔ قطعہ تاریخ وفات انیس آغائی نے کہا ہے :

مصرعِ تاریخِ ہجری سال یہ کہدو انیس
مرگِ فاروقی سے ہائے آج ہیں سب اشکبار ۱۳۹۸ھ

عیسوی تاریخ عزیز قدوسی نے کہی ہے :

صاحبِ علم، قوم کے ہمدرد وقفِ خدمت تھی زندگی جن کی
بزمِ ہستی سے اٹھ گئے افسوس تھے جو عالی دماغ فاروقی

۱۹۷۷ء

ان کی شادی سرول (ضلع ایوت محل) کے ایک زمیندار کی بیٹی خیر النسا سے
ہوئی تھی ۔ اولاد میں تین بیٹے جمیل الرحمٰن، جلیل الرحمٰن اور فضل الرحمٰن
اور تین بیٹیاں ہوئیں ۔

محمد ظہیر وارثی :

محمد ظہیر وارثی علمی و ادبی ذوق کے لحاظ سے کامٹی کے سلسلۃ الذہب کی آخری
کڑی ہیں ۔ وہ نہ صرف شعر و ادب کا اعلا ذوق رکھتے ہیں بلکہ سخن فہمی اور شعرا

نوازی میں بھی لاجواب ہیں۔
کامٹی کے دیگر خاندانوں کی طرح ان کا خاندان بھی مئو (ضلع اعظم گڑھ) سے ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد یہاں آباد ہوگیا تھا۔ ان کے پردادا میاں جی محمد سلیمان (ف: ۱۹۰۲ء) ابن میاں جی غلام حسین، ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ انھیں تصوف و سلوک سے گہرا لگاؤ تھا۔ ان کے دادا کا نام محمد احمد تھا جو خام چمڑوں کے ایک کامیاب تاجر تھے۔ انھوں نے ۱۹۰۶ء میں بمرضِ طاعون رحلت فرمائی۔ ان کے دو ہی بیٹے تھے۔ عبدالرشید (ف: ۱۹۰۸ء) اور حافظ محمد بشیر (ف: ۱۹ جولائی ۱۹۴۱ء)۔ محمد ظہیر وارثی کے والد کا نام حافظ محمد بشیر تھا۔
محمد ظہیر وارثی ۱۹۱۶ء میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اردو اور دینیات کی ابتدائی تعلیم حافظ محمد سراج الدین سے حاصل کی۔ پرائمری اسکول کا امتحان مدرسہ سراج المومنین، کامٹی سے پاس کیا۔ یہیں اردو اور فارسی کی چند معیاری کتابیں مجددی سلسلے کے ایک بزرگ مولانا قاری حافظ حکیم عبدالرحمٰن بھوپالی پوری (ف: ۱۹۳۵ء) سے پڑھیں۔ بعد کو مطالعے کی کثرت نے ان کے علم میں بیش بہا اضافے کیے۔ شعر و ادب، تصوّف و سلوک اور سیاست و مذہب وغیرہ علوم و فنون پر جو دسترس ان کو حاصل ہے، اس کی مثال کامٹی میں مشکل سے ملے گی۔
وہ نوجوانی سے ہی علمی، ادبی، سیاسی اور سماجی کاموں میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ جب ان کی عمر بیس سال تھی تو ۱۹۳۶ء میں انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری کے صدر منتخب کیے گئے۔ اس منصب پر ۱۹۵۴ء تک فائز رہے۔ ان کے دور میں لائبریری نے خوب ترقی کی اور اس کے ذخیرے میں انمول اضافے ہوئے۔ اسی طرح ۱۹۷۰ء میں مدرسہ سراج المومنین، کامٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے۔ وہ آج بھی اس

منصب پر فائز رہ کر مدرسے کے لیے بیش بہا خدمات انجام دے رہے ہیں۔
سیاسی اعتبار سے آزادی سے پہلے اُن کا تعلق مسلم لیگ سے تھا۔ لیکن آزادی کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں شامل ہو گئے۔ وہ مسلم لیگ، شاخ ناگپور کے سکریٹری (۱۹۴۴ء تا ۱۹۴۷ء) بھی رہ چکے ہیں۔ انھیں ۱۹۴۷ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ممبر بھی بنایا گیا تھا۔
چونکہ ان کا تعلق بنکر برادری سے ہے، اس لیے بنکروں کی فلاح و بہبودی کے لیے وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف اوقات میں کامٹی ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کے سکریٹری (۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۰ء)، فرینڈس ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی کامٹی کے صدر (۱۹۴۷ء تا ۱۹۵۸ء)، اور کامٹی ویورس کوآپریٹیو سوسائٹی یونین کے سکریٹری (۱۹۴۴ء تا ۱۹۶۰ء) رہ چکے ہیں۔
ان کی خدمات کے صلے میں صوبائی حکومت نے انھیں ۱۹۵۳ء میں ودربھ پراونشیل کوآپریٹیو سوسائٹی کا ڈائریکٹر مقرر کیا تھا۔ وہ اس منصب پر ۱۹۶۰ء تک فائز رہے۔ پھر ۱۹۶۱ء میں مہاراشٹر گورنمنٹ نے انھیں ہینڈلوم بورڈ کا ممبر نامزد کیا۔ جہاں ۱۹۶۷ء تک اپنی خدمات پوری دیانتداری اور تندہی سے انجام دیتے رہے۔
اس کے علاوہ وہ ۱۹۴۲ء سے ۱۹۶۰ء تک ربانی ہائی اسکول کامٹی کے اساتذہ کے نمائندے کی حیثیت سے ممبر بھی رہے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں صوبائی جمعیۃ العلما کے سکریٹری بنائے گئے اور جمعیت کی مرکزی کونسل کے لیے ممبر بھی منتخب کیے گئے۔ وہ ۱۹۴۱ء میں مسجد وارث پورہ کامٹی کے سکریٹری مقرر کیے گئے تھے۔
وارثی صاحب نہایت مخلص، ملنسار اور مہمان نواز ہیں۔ اپنا زیادہ وقت کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتے ہیں۔ چونکہ ابتدا ہی سے اخبارات و رسائل اور کتابیں خرید کر پڑھنے کی عادت رہی ہے، اس لیے ان کے پاس نادر و نایاب

کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ممتاز اخبارات و رسائل کا تقریباً اسّی سال کا ریکارڈ بھی ان کے یہاں محفوظ ہے۔

انھیں تصوف و سلوک اور مذہب سے گہرا لگاؤ ہے۔ یہ دولت انھیں طالبعلمی کے زمانے میں حکیم عبدالرحمٰن بھولے پوری کی ہم نشینی سے حاصل ہوئی ہے۔ سلسلۂ طریقت میں قاضی عبدالواسع وارثی (ف : ۱۹۵۵ء) کے مرید ہیں۔

علمی، ادبی، سیاسی، سماجی، مشغولیت کے ساتھ ساتھ وہ ۱۹۳۰ء سے مسلسل روزنامچہ لکھ رہے ہیں۔ جس میں اہم ادبی، سیاسی، سماجی اور مذہبی واقعات درج ہیں۔ ان کے پاس ان کے پسندیدہ اشعار کا ایک صاف ستھرا اور لطیف انتخاب بھی موجود ہے۔ غرض کامٹی میں کئی اعتبار سے ان کا مرتبہ بلند اور ممتاز ہے۔

حمید جمال :

سعید اور اخگر کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔ امرائی، مئو ناتھ بھنجن، ضلع اعظم گڑھ میں ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ ان کا خاندان وہیں سے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے دو سال بعد نقلِ مکانی کر کے کامٹی آیا تھا۔ ان کے دادا کا نام محمد ترسم تھا، جو ایک مذہبی انسان تھے۔ انھوں نے حج بھی کیا تھا۔ ان کے چار بیٹے تھے : عبداللہ، عبدالوارث، محمد اسمٰعیل اور حافظ محمد جمال الدین۔ سعید کے والد کا نام عبداللہ تھا، عبدالوارث اخگر کے والد تھے اور حمید جمال کے والد کا نام حافظ محمد جمال الدین تھا، جو ۴ اگست ۱۹۳۲ء کو فوت ہوئے۔

چونکہ اس خاندان کے بیشتر لوگ تجارت کے سلسلے میں ممالک متوسط و برار کے مختلف علاقوں میں عارضی طور سے سکونت پذیر ہو گئے تھے،

حافظ محمد جمال الدین کو بھی کچھ عرصے موضع کندری، ڈگرس ضلع ایوت محل میں گزارنے پڑے۔ انھی ایام میں ۱۹ نومبر ۱۹۱۸ء کو حمید جمال کندری میں پیدا ہوئے۔

انھوں نے مدرسہ سراج المومنین کامٹی سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد گورنمنٹ مڈل اسکول کامٹی سے مڈل اسکول کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں انجمن ہائی اسکول ناگپور سے ۱۹۳۶ء میں میٹرک کیا۔ پھر ۱۹۲۸ء میں ٹیچرس ٹریننگ کا ڈپلوما جبلپور سے حاصل کیا۔ ۱۹۴۰ء میں ادیب فاضل کی سند لی۔ ۱۹۴۹ء میں ناگپور یونیورسٹی سے بی اے کیا اور ۱۹۶۶ء میں اسی یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا۔

انھیں میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے فوراً بعد ہی ربانی ہائی اسکول میں ملازمت مل گئی تھی، یہاں ۱۹۷۱ء تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ جسمانی طور پر بہت کمزور و نحیف تھے۔ صحت عام طور سے کبھی اچھی نہیں رہی۔ انتقال ۴ مئی ۱۹۸۰ء کو ہوا۔ مسلم قبرستان کامٹی میں آسودۂ خواب ہیں۔

فیض انصاری :

فیض انصاری رشتے میں جلیل عرشی کے چچا ہیں۔ یعنی وہ عرشی کے چھوٹے دادا عباداللہ کے بیٹے ہیں۔ عباداللہ ایک دیندار انسان تھے۔ ان کی وفات ۱۹۲۱ء میں کھولاپور (ضلع امراؤتی) میں ہوئی۔ ان کے چار بیٹے تھے: محمد ابراہیم، عبدالقادر، محمد یعقوب اور محمد یوسف (فیض انصاری)۔ ان میں سے عبدالقادر اور فیض انصاری نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔ عبدالقادر، جو اب تک بقید حیات ہیں اور ناگپور میں رہتے ہیں، ایک اچھے منتظم اور سیاست داں ہیں۔ انھوں نے ناگپور میں بنکروں کی فلاح و بہبودی کے لیے کئی مفید اور کارآمد امور انجام دیے ہیں۔ وہ انصار

ڈائنگ کوآپریٹیو سوسائٹی، ناگپور کے طویل عرصے تک صدر رہ چکے ہیں۔ ان کے دور میں مذکورہ سوسائٹی نے بے مثال ترقی کی۔ انصار نگر ہاؤسنگ سوسائٹی کا منصوبہ انھی کی جدوجہد اور کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ کئی تعلیمی اداروں میں بھی ان کی خدمات رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ کانگریس کے ایک سرگرم کارکن رہے ہیں۔ سیاست میں پرجوش حصہ لینے کی وجہ سے دو مرتبہ (۱۹۳۴ء تا ۱۹۳۷ء، ۱۹۳۷ء تا ۱۹۴۱ء) ناگپور میونسپل کمیٹی کے ممبر نامزد کیے گئے۔ انھیں مذہبی معاملات سے دلی لگاؤ ہے۔ خدا نے حج کی سعادت بھی عطا کی ہے۔ فی الحال خانہ نشینی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

فیض ۱۹۲۰ء میں کھولاپور میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ثانوی تعلیم ربانی ہائی اسکول کامٹی میں پائی۔ وہ اپنے برادرِ بزرگ حاجی عبدالقادر کے ہمراہ ۱۹۲۰ء میں کامٹی آئے تھے۔ حافظ دین محمد (مالک ہاکی بیڑی کامٹی) نے بیڑی سازی کا جو کارخانہ کھولا تھا، اس میں حاجی عبدالقادر بھی شریک تھے۔ لیکن دونوں کے تعلقات زیادہ عرصے تک استوار نہ رہ سکے اور وہ ۱۹۳۲ء میں ناگپور چلے آئے اور وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ اب فیض بھی ان کے ساتھ ناگپور میں رہنے لگے۔ لیکن جب کھنڈوہ کے ایک مشہور ٹھیکیدار محمد فریدالدین کی بیٹی سے ان کی شادی ہوگئی تو کچھ عرصے بعد بھائی سے علاحدگی اختیار کرلی اور کامٹی میں رہنے لگے۔ خدا نے انھیں اولاد سے محروم رکھا تھا۔

بیڑی کے پتوں کا کاروبار ہمیشہ ان کے معاش کا ذریعہ رہا۔ ان کی پوری زندگی خوش حالی اور فارغ البالی میں گزری۔ شبِ جمعہ، ۷ مئی ۱۹۷۱ء کو اچانک دل کی حرکت بند ہوجانے سے انتقال ہوا۔ مسلم قبرستان، کامٹی میں سپردِ خاک کیے گئے۔ تاریخِ وفات تابش حلیمی نے کہی ہے:

ہاں نہیں ہے وہ خوش نگار ادیب ۱۳۹۱ھ

درد فرقت بنا ہے صبر طلب ۱۳۹۱ھ

فیض دارالبقا میں چل ہی دیے ۱۳۹۱ھ

ہوئی خاموش آہ شمعِ ادب ۱۳۹۱ھ

ناگپور اور کامٹی کی صحافت کی ترقی میں ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔ انھوں نے سب سے پہلے قادر نیازی (ف : ۳۱ اگست ۱۹۸۰ء) اور عثمان اقبال کے ساتھ مل کر ۱۹۳۷ء کے وسط میں بچوں کا پہلا ماہنامہ عزیز ناگپور سے جاری کیا تھا۔ اس کے صرف چھ سات شمارے نکلنے پائے تھے کہ بند ہو گیا۔ پھر وہ چاند کے مدیر ہوئے۔ ان کے ساتھ شفیقہ فرحت بھی مجلسِ ادارت میں تھیں۔ یہ پرچہ جنوری ۱۹۵۲ء میں جاری ہوا تھا اور جون ۱۹۵۴ء تک نکلتا رہا۔ اس کے بعد انھوں نے اپریل ۱۹۵۷ء میں کامٹی سے ماہنامہ خیال جاری کیا، جس کا تفصیلی ذکر اخبارات و رسائل کے باب میں کیا گیا ہے۔ وہ ہمیشہ اردو کی حفاظت و ترقی کے لیے کوشاں رہے اور جب تک زندہ رہے، برابر کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہے۔ کل ہند اردو مصنفین کنونشن ناگپور ان کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ انھوں نے اس کا تمام بار خود ہی برداشت کیا تھا۔ اس میں جن مندوبین نے شرکت کی تھی، ان میں کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، ابراہیم ہوش، کلام حیدری، ڈاکٹر محمد حسن کے اسمائے گرامی قابلِ ذکر ہیں۔ یہ کنونشن ۲۳، ۲۴، ۲۵ اپریل ۱۹۶۰ء کو انجمن ہائی اسکول، ناگپور میں ہوا تھا۔ غرض وہ ایک نہایت سرگرم اور متحرک انسان تھے اور ہمیشہ اردو زبان و ادب کی خدمت میں مصروف رہا کرتے تھے۔

اخبارات و رسائل

کامٹی میں صحافت کی بنیاد مولانا محمد عمر انصاری اطہر نے ۱۹۲۵ء میں ڈالی اور بیک وقت دو پرچے جاری کیے ؛ سہ روزہ جمہور اور ماہنامہ درِ سخن۔ لیکن معاشی بدحالی کے سبب یہ دونوں پرچے زیادہ عرصے تک جاری نہ رہ سکے۔ اس کے بعد عبد الستار فاروقی نے ۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو ہفتہ وار الفاروق نکالا، جو ۲۷ سال تک اس علاقے کا واحد ترجمان بنا رہا۔ الفاروق کے آخری دور میں فیض انصاری نے اپریل ۱۹۵۰ء میں ماہنامہ خیال کا اجرا کیا ؛ لیکن چار سال بعد یہ رسالہ بھی معاشی پریشانیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ بعد کو ہفتہ وار تاج ؛ پندرہ روزہ امنگ، پندرہ روزہ رقیب، ہفت روزہ لہو ترنگ، ہفت روزہ اخوت جاری ہوئے۔ ان پرچوں میں الفاروق اور خیال کو ہمہ گیر شہرت ملی۔ اگرچہ کامٹی میں کتابت و طباعت کی سہولتیں مفقود ہیں، اس کے باوجود ان پرچوں کا جاری ہونا ایک حیرت انگیز ادبی کارنامہ ہے اور اس کے لیے ان کے مدیروں کا عزم و حوصلہ قابلِ تعریف ہے۔ ان پرچوں کی تفصیلات حسبِ ذیل ہیں :

سہ روزہ جمہور ؎ (صوبہ متوسط و برار کا ترجمان)

یہ اخبار $\frac{20 \times 30}{4}$ سائز پر ہفتے میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اس کی سالانہ قیمت ۴ روپے تھی۔ ایک پرچے میں صرف چھ صفحے اور قیمت دو پیسے تھی۔

اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر مولانا محمد عمر انصاری اطہر تھے۔ یہ ۲۵ اپریل ۱۹۲۵ء کو جاری ہوا، لیکن معاشی بدحالی کی وجہ سے ایک سال کے اندر ہی بند ہوگیا۔ ہر صفحے میں تین مساوی کالم ہوتے تھے۔ اس میں خبروں اور مضامین کے علاوہ بیرونی اور مقامی شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا تھا۔ اخبار کے سرورق پر اقبال کا یہ مشہور شعر چھپتا تھا:

سلطانیِ جمہور کا آتا ہے زمانہ　　جو نقشِ کہن تم کو نظر آئے مٹادو

اور پشت پر یہ شعر ملتا ہے۔

از غلامی فطرتِ آزاد را رسوا مکن　　تا تراشی خواجۂ از برہمن کافر تری

جمہور نے اپنی مختصر زندگی میں رسولؐ نمبر شائع کیا تھا، جو بہت اہم ہے۔ اس میں راجہ رادھا پرشاد صاحب بی اے، ایل ایل بی آف تیلوتھوا اسٹیٹ کی عالمانہ تقریر" رحمتِ عالم کے اخلاق" بلند پایہ ہے۔ وحدتِ مذاہب پر ایڈیٹر ٹائمز آف انڈیا ڈیرسب کا مضمون بھی قابلِ ذکر ہے۔

درِّ سخن (ماہنامہ):

یہ ماہنامہ بھی جمہور کے مدیر نے جاری کیا تھا۔ جمہور پریس جہاں یہ دونوں پرچے چھپتے تھے ان کی ذاتی ملکیت تھا۔ درِّ سخن ۲۰×۳۰ سائز پر ہر مہینے ۳۲ صفحوں پر نکلتا تھا۔ ایک پرچے کی قیمت ۲ آنے اور سالانہ ڈیڑھ روپے تھی۔ عمر انصاری کے ساتھ مولانا انور کامٹوی بھی ادارۂ تحریر میں شامل تھے۔ یہ پرچہ مارچ ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر عبدالرحمٰن، آئی ایم ڈی کی سرپرستی میں شروع ہوا۔ لیکن افسوس کہ صرف تین شمارے نکل سکے اور یہ رسالہ بند ہوگیا۔ اس میں عبدالقیوم شفق امروہی، مولانا علیم اللہ خیالی برہانپوری، عبدالحمید خان زیبا کوٹی، مولانا ناطق گلاؤٹھوی، جوش ملیح آبادی، وقار عظیم، مولانا حبیب اللہ غضنفر علیگ، خلیل الہدیٰ شارق، قیصر امراؤتوی، عبدالرزاق خان بی اے

ایل ایل بی اور دیگر مقامی ادبا و شعرا کی ادبی و شعری تخلیقات شائع ہوئی ہیں۔

مصوّر الفاروق (ہفتہ وار)

یہ ہفتہ وار پہلے ۱۸×۲۲/۲ سائز پر نکلا، لیکن بعد میں اس کا سائز ۲۰×۳۰/۴ ہو گیا۔ بالعموم اس میں ۸ سے ۱۲ صفحے ہوتے تھے۔ اس کی قیمت ڈھائی روپے سے بڑھ کر چھ روپے سالانہ تک گئی تھی۔ اس کے ایڈیٹر عبدالستار فاروقی تھے۔

الفاروق ۳ جولائی ۱۹۳۵ء کو الفاروق پریس کامٹی سے نواب غازی آف گیوردھا اسٹیٹ کی سرپرستی میں جاری ہوا۔ قبولیتِ عامہ کے باعث یہ اخبار صحیح معنوں میں ۲۷ سال یعنی ۱۹۶۲ء تک صوبے کا واحد ترجمان بنا رہا۔ اس میں دو تین اور چار کالم ہوتے تھے۔ پہلے صفحے کے بالائی حصّے میں اخبار کے نام کے ساتھ کبھی کبھی اقبال کا یہ شعر ہوتا تھا:

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

تقسیم ملک سے پہلے یہ اخبار مسلم لیگ کا موافق تھا۔ بعد کو یہ کانگریس پارٹی کا خاص آرگن بن گیا۔ اس کا اداریہ فاروقی صاحب خود لکھا کرتے تھے اور ملّی مسائل، طرزِ معاشرت اور دوسرے معاملات پر بڑی بے باکی سے رائے دیا کرتے تھے۔

پرچے کا معیار کافی بلند تھا۔ اس میں ملک بھر کی خبریں شائع ہوتی تھیں۔ مقامی اور باہر کے شعرا کا کلام بھی شائع ہوتا اور مضامین، مقالے اور افسانے بھی چھپتے تھے۔ اس حقیقت میں دو رائے نہیں ہو سکتی کہ ودربھ میں اردو زبان و ادب کی ترقی میں اس اخبار نے ایک اہم کردار ادا کیا ہے۔

خیال (ماہنامہ) ٤

خیال وسط ہند کا بہترین ماہنامہ تھا۔ اس کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر سب کچھ فیض انصاری تھے۔ اپریل، ۱۹۵۵ء میں یہ پرچہ منظرِ عام پر آیا اور بہت ہی قلیل عرصے میں اردو کے چوٹی کے پرچوں میں شمار ہونے لگا۔ پہلے اس رسالے کے نائب مدیر ماسٹر علیم الدین تھے۔ بعد کو عرصۂ دراز تک زبیر رضوی اس کے مدیر اعزازی رہے۔ رسالے کا صحافتی معیار کافی بلند تھا۔ اس میں ہندوستان کے صفِ اوّل کے مصنّف اور شعرا حصّہ لیتے تھے۔ لیکن افسوس کہ یہ رسالہ مالی پریشانیوں کی بھینٹ چڑھ گیا۔ آخری شمارہ دسمبر ۱۹۶۱ء کا تھا۔

خیال عام شماروں کی طرح ۲۰×۳۰ سائز پر دیال پریس، دہلی سے چھپ کر آتا۔ خوبصورت اور رنگین ٹائیٹل رسالے کے حسن کو چار چاند لگا دیتے تھے۔ کتابت اور طباعت کافی عمدہ تھی۔

خیال کے معیار کا اندازہ لگانے کے لیے اس کے چند منتخب مضامین کی فہرست ملاحظہ فرمائیے، جو اس کی حیاتِ مختصر میں شائع ہوئے ہیں:

اکبر خطوط کے آئینے میں از انصار اللہ الغامدار (اپریل، ۱۹۵۵ء)؛ اردو زبان کا مستقبل از قاضی عبدالغفار؛ موسیقی کی کتابیں از نصیر الدین ہاشمی (ستمبر ۱۹۵۹ء)؛ منٹو از دیوندر اسر؛ تخلیق کا پہلا کرب از نسیم سہارنپوری (اکتوبر ۱۹۵۹ء)؛ شاہد صدیقی از عوض سعید؛ بات سے بات از فیض انصاری (نومبر ۱۹۵۹ء)؛ رام لعل از دریندر دھہرو (مارچ ۱۹۶۰ء) شاہ باقر از نصیر الدین ہاشمی (اپریل ۱۹۶۰ء)؛ ہمارے ادیب اور معاشرہ از اکرام ادیب (جون جولائی ۱۹۶۰ء)؛ ادیبوں کے مسائل از کوثر چاندپوری؛ انور خواجہ از تاج سعید (اگست ستمبر اکتوبر ۱۹۶۰ء)؛ مظہر امام از شہزاد

منظر (نومبر ۱۹۶۰ء) ؛ محسن زیدی از خواجہ مقبول احمد ؛ ابو نواس از تمکین کاظمی (مارچ ۱۹۶۱ء) ؛ میکدے کا چراغ (عزیز عظیم آبادی اور ان کی رباعیاں) از ڈاکٹر علی اکبر نقوی (دسمبر ۱۹۶۱ء)۔

اس کے علاوہ خیال میں اس عہد کے جن ممتاز شعرا کا کلام بالالتزام شائع ہوتا رہا ہے ان کے نام یہ ہیں: یونس قنوجی، خلیل الرحمٰن اعظمی، علی جواد زیدی، پروفیسر منظور حسین شور، حرمت الاکرام، آنند نرائن ملاؔ، مجروح سلطانپوری، شاد عارفی، سلام مچھلی شہری، نشور واحدی، محوی صدیقی، جمیل مظہری، اثر لکھنوی، ثاقب کانپوری، رئیس امروہی، قتیل شفائی، سلیمان اریب، اختر انصاری وغیرہ۔

تاج (ہفتہ وار)

جناب ظہیر افروز کی ادارت میں اس کا پہلا شمارہ ۴ جولائی ۱۹۶۶ء کو شائع ہوا۔ اس میں شب و روز کی خبریں شائع ہوتی تھیں اور مقامی و غیر مقامی شعرا کا کلام بھی۔ ناگپور میں اس کی طباعت ہوتی تھی۔ ظہیر افروز کے انتقال (۷ جون ۱۹۷۴ء) کے کچھ دن بعد بند ہو گیا۔ یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو وکیل عارف نے دوبارہ جاری کیا لیکن چند ماہ بعد پھر بند ہو گیا۔ حال ہی میں ظہیر افروز کے صاحبزادے مظفر سعید افروز نے نئے انتظامات کے ساتھ شائع کرنا شروع کیا تھا، لیکن دو تین شماروں کے بعد پھر بند ہو گیا۔

اُمنگ (پندرہ روزہ)

اس پرچے کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر شمیم فیضی اور مدیر معاون مقتول وارثی تھے۔ یکم مارچ ۱۹۷۰ء کو جاری ہوا۔ اس میں زیادہ تر سیاسی

خبریں شائع ہوتیں۔ عوام کا بیباک ترجمان تھا۔ کچھ عرصے بعد یہ بھی معاشی پریشانیوں کا شکار ہوگیا۔

رقیب (پندرہ روزہ)

یہ پرچہ ۲۵ جون ۱۹۷۷ء کو نصیر عظیمی کی ادارت میں جاری ہوا۔ اس کی اشاعت میں بڑی بے قاعدگی رہی ہے۔ یہ حال ہی میں بند ہوا ہے۔ سیاسی، اقتصادی، تعلیمی اور سماجی پرچہ تھا۔ منہ کا ذائقہ بدلنے کو کبھی کبھی شعرا کا کلام بھی چھپتا تھا۔ اس کی طباعت، ناگپور میں ہوتی تھی۔ ۱۹۷۹ء میں کچھ عرصے کے لیے اس کی ادارت کے فرائض عبدالرحیم نشتر نے انجام دیئے ہیں۔ رقیب کے ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر نصیر عظیمی (سید نصیر الدین) اردو زبان و ادب کے بے لوث خادم ہیں۔ ان کا خاندان مدراس کا رہنے والا ہے۔ ان کے جدِ اعلا سید حسین بحیثیتِ سپاہی کامٹی آئے اور یہیں بس گئے۔ ان کے دادا سید عمر (ف ۱۹۳۴ء) پوسٹ اینڈ ٹیلیگراف آفس میں کلرک تھے۔ والد کا نام سید عبدالقیوم تھا۔

نصیر عظیمی کی پیدائش ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کو کامٹی میں ہوئی۔ انھوں نے ۱۹۴۶ء میں ربانی ہائی اسکول کامٹی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں ناگپور یونیورسٹی سے بی اے اور ساگر یونیورسٹی سے ڈپلوما اِن ٹیچنگ کیا۔ میٹرک کا امتحان پاس کر لینے کے فوراً بعد ہی ۱۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء کو انھیں ربانی ہائی اسکول میں مدرسی کی جگہ مل گئی تھی۔ یہاں ۱۹۶۳ء تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیئے۔ اب ٹیوشن پر گزر بسر کر رہے ہیں۔ فی الحال ان کی زندگی پریشان کن مرحلوں سے گزر رہی ہے۔

انھیں طالبعلمی کے زمانے میں ۱۹۴۴ء میں افسانے، کہانیاں اور مکالمے لکھنے

کا شوق ہوا تو ماسٹر ریاض رؤفی اور حمید جمال نے ان کی رہبری کی ۔ رفتہ رفتہ ادبی ذوق پروان چڑھتا رہا ۔ انھوں نے "انجمن" کے نام سے ایک کتابچہ چھپوایا ہے، جس میں اس مشاعرے کی غزلیں ہیں، جو ۹ ستمبر ۱۹۴۸ء کو حمید ناگپوری کی صدارت میں کامٹی میں ہوا تھا ۔ انھیں شعر گوئی سے بھی مزاولت ہے ۔ اس میں شاطر حکیمی سے مشورہ کرتے ہیں ۔

لہو ترنگ (ہفتہ وار)

کامٹی سے وسنت دیش پانڈے لہو ترنگ کے نام سے ہندی میں ایک پرچہ نکالا کرتے تھے ۔ انھوں نے ۱۹۷۵ء میں اس کا اردو ایڈیشن جاری کیا، لیکن ایک ڈیڑھ سال کے اندر ہی بند ہو گیا ۔ لہو ترنگ (اردو) کے ادارۂ تحریر میں انیس پرواز، نصیر عظیمی اور وکیل عارف شامل تھے ۔ یہ پرچہ کامٹی میں چھپتا تھا ۔ اس میں خبروں کے علاوہ دینی و سماجی موضوعات پر مضامین بھی شائع ہوئے ہیں ۔

اخوت (ہفتہ وار)

یکم جنوری ۱۹۸۱ء کو جاری ہوا ۔ اس کے چیف ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر وکیل عارف ہیں ۔ پرچے کی طباعت ناگپور میں ہوتی ہے ۔ اس میں سیاسی، سماجی، ادبی اور تعلیمی خبروں اور مضامین کے علاوہ منظومات بھی شائع ہوتی ہیں ۔ اس کا معیار اوسط درجے کا ہے ۔ طباعت و کتابت بھی بری نہیں ہے ۔

اس کے ایڈیٹر بھی اردو زبان و ادب کے ایک پرخلوص خادم ہیں ۔ وہ ۱۹۳۰ء میں کامٹی میں پیدا ہوئے ۔ تعلیم ربانی ہائی اسکول کامٹی میں حاصل کی ۔ سماجی، سیاسی اور صحافتی میدان میں ان کی خدمات بہت اہم ہیں ۔

شاعری سے بھی مزاولت رکھتے ہیں۔ انھیں ۲۶ جنوری ۱۹۷۶ء کو ہینڈلوم
پر تیار شدہ کپڑوں کے کل مہاراشٹر مقابلے میں پہلا انعام بھی مل چکا ہے۔
ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ۱۹۷۶ء میں لہو ترنگ (اردو) کے معاون اڈیٹر
کی حیثیت سے ہوا۔ پھر یکم جنوری ۱۹۷۷ء کو ہفتہ وار تاج، کامٹی کا دوبارہ
اجرا کیا۔ ۱۵ اگست ۱۹۷۷ء کو ہفتہ وار نقوش، ناگپور کی ادارت سنبھالی
جو ۱۹۷۸ء تک ان کی نگرانی میں نکلتا رہا۔ اس کے بعد یکم جنوری ۱۹۷۹ء
کو ہفتہ وار دھوپ چھاؤں، ناگپور کے مدیر ہوئے۔ اس پرچے کے دسمبر ۱۹۸۰ء
تک مدیر رہے۔ چونکہ یہ تمام پرچے دوسروں کی ملکیت تھے، اس لیے اب انھوں
نے خود اپنے نام سے رجسٹریشن نمبر حاصل کرکے ہفتہ وار اخوت کا اجرا کیا،
جو آج بھی پابندی سے نکل رہا ہے۔ اس کے لیے وہ تنہا جس جذبے، لگن اور
محنت سے کام کرتے ہیں، اس کی مثال بہت مشکل سے ملے گی۔

ادبی و تعلیمی ادارے

کامٹی کے شاعروں اور ادیبوں کی ذہنی و فکری نشو و نما میں، جن ادبی و تعلیمی اداروں نے حصّہ لیا ہے؛ ان کی مختصر تاریخ یہ ہے۔

محفلِ نقشِ سخن :

اس انجمن کا قیام انیسویں صدی کی آخری دہائی میں سعید اور ان کے تلامذہ کی کوششوں سے عمل میں آیا۔ سعید اس کے سرپرست تھے اور عبدالقادر راحگر ناظم اور فیض اللہ فیض میر منشی تھے۔ اس کی ترقی کے لیے محمد اسحٰق اسحٰق نے نہ صرف دل کھول کر مالی تعاون دیا، بلکہ اپنا ایک مکان "پیلی حویلی" بھی اس کی سرگرمیوں کے لیے وقف کر دیا تھا۔ یہ محفل انتہائی فعال اور متحرک تھی۔ اس کے زیرِ اہتمام ایک لائبریری قائم کی گئی؛ مشرقی علوم کی ترویج و ترقی کے لیے شبینہ مدارس جاری کیے گئے۔ متعدد علمی و ادبی مذاکرات منعقد ہوئے۔ ڈرامے کا انعقاد کیا گیا۔ اس کی سرگرمیاں دھیرے دھیرے تیز ہو رہی تھیں کہ ۱۹۰۲ء میں کامٹی میں پلیگ کی وبا پھوٹ پڑی؛ جس سے شہری زندگی درہم برہم ہو کر رہ گئی۔ اس کے بیشتر اراکین پلیگ کا شکار ہو گئے؛ جس کے باعث اس کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں اور رفتہ رفتہ اس کا خاتمہ ہو گیا۔

مدرستہ المسلمین :

اس مدرسے کی بنیاد کامٹی کے چند خدا رسیدہ بزرگوں نے انیسویں صدی کی آخری دہائی میں ڈالی تھی۔ لیکن بیسویں صدی کی ابتدا میں اس کی سرگرمیاں سرد پڑ چکی تھیں، لہٰذا اسے بند کر دینا پڑا۔ پھر ۱۹۲۶ء میں ماسٹر شیخ حسین ربانی (۱۸۷۹ء۔ ۱۹۳۷ء) کی کوششوں سے اس مدرسے کو از سر نو زندگی ملی۔ انھوں نے اس کے لیے ایک عالیشان عمارت تعمیر (۱۹۲۴ء) کروا کے اردو پرائمری اسکول جاری کیا۔ حالانکہ ابتدا میں یہ صرف ایک دینی مدرسہ تھا۔ یہی ادارہ ۱۹۳۲ء میں مڈل اسکول بنا۔ جب ۱۹۳۷ء میں ماسٹر ربانی کا انتقال ہو گیا تو ان کی تعلیمی خدمات کو زندہ رکھنے کے لیے اس کے نام میں اضافہ کر کے ایم ایم ربانی اسکول (مدرستہ المسلمین ربانی اسکول) کر دیا گیا۔ اسے ۱۹۳۸ء میں ہائی اسکول کا درجہ ملا۔ پھر یہ ملٹی پرپز ہائر سکنڈری اسکول ہوا اور اب جونیر کالج ہے

اس میں مڈل اسکول سے جونیر کالج تک تقریباً نو سو طالبعلم اردو کے ذریعے جدید تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ یہاں آرٹس اور سائنس کے تمام مضامین اردو میں پڑھائے جاتے ہیں۔

اس ادارے کی تعمیر و ترقی میں ماسٹر ربانی کے علاوہ خان بہادر میر نیاز علی، الحاج خواجہ میاں پٹیل، ڈاکٹر عبدالرحمٰن احمدی، محمد ممتاز، عبدالغنی ٹھیکیدار، زینب بائی، حاجی عبدالرحمٰن، محمد یوسف کلام، عبدالقیوم اورسیئر، حاجی عبدالجبار ٹھیکیدار، عبدالخالق رٹائر تحصیلدار، حاجی اسمٰعیل منیجر، حاجی مولا شریف، ماسٹر صفی اللہ عادل، منشی فیض اللہ فیض، عبدالستار فاروقی، بابو عبدالرحیم، عبدالحفیظ انصاری اور الحاج عبدالمتین نے پرجوش حصہ لیا ہے۔

نیا بازار کلب :

محفلِ نقشِ سخن کے خاتمے کے بعد ادبی سرگرمیوں کو پھر سے زندہ کرنے کے لیے بڑے فضل، سید عظیم الدین انجینیر، سید بشیر الدین، محمد طالب الدین طالب اور ماسٹر شیخ حسین ربانی وغیرہم نے اس کلب کو جاری کیا تھا۔ اس دور کے یہ وہ نوجوان تھے جو جدید علم و تہذیب اور افکار و خیالات سے آشنا تھے۔ اس کلب کے لیے اس وقت کے ایک علم دوست پارسی رئیس دادا بھائی نوشیروان نے ایک وسیع مکان مرحمت فرمایا تھا۔ یہی مکان اب ربانی جونیر کالج کی ملکیت ہے۔

اس کلب نے اردو زبان و ادب کی ترقی و اشاعت کے لیے کئی مفید امور انجام دیئے ہیں۔ اس کے عہدیداران و اراکین نے کافی جد و جہد کے بعد ایک لائبریری کھولی تھی، تاکہ اس علاقے کے لوگوں میں ادبی کتابوں کے مطالعے کا شوق پیدا ہو سکے۔ انھوں نے طرحی مشاعروں کا انعقاد کیا۔ اس سے نوجوانوں میں شعر و شاعری سے دلچسپی بڑھنے لگی۔ بعد کو یہ کلب طبقاتی کشمکش کا شکار ہو گیا تھا۔ یہاں اس بات کا تذکرہ انتہائی ضروری ہے کہ عبدالستار فاروقی، محمد طالب الدین طالب اور ماسٹر شیخ حسین ربانی کی فکری و ذہنی نشو و نما اسی کلب کی علمی و ادبی فضا میں ہوئی ہے۔

دارالمعلومات :

محمد طالب الدین طالب اور ان کے چند ساتھی، جو نیا بازار کلب کے سرگرم کارکن تھے، اختلافات کے باعث ۱۹۲۰ء میں کلب سے علاحدہ ہو گئے اور محلہ مودی کامٹی میں ایک نیا ادارہ دارالمعلومات ۱۹۲۳ء میں کھولا؛

جس نے ایک سال کے قلیل عرصے میں اچھی خاصی ترقی کر لیا تھا۔ اس کے میر مجلس، محمد عبدالرزاق کنٹراکٹر اور ناظم محمد طالب الدین طالب تھے۔
اس ادارے کے پروگرام میں بزم مشاعرہ اور بزم مباحثہ کا انعقاد، ایک رسالے کا اجرا اور ایک لائبریری کا قیام شامل تھا۔ اس کاز کی تکمیل کے لیے اس کے ذمے داروں نے نوجوانوں میں ادبی و علمی ذوق پیدا کرنے کے لیے مباحثے کی موضوعاتی مجالس منعقد کیں، ممتاز اہلِ علم کی تقریروں کا اہتمام کیا۔ طرحی مشاعرے کروائے اور اعلا پیمانے پر ایک لائبریری کی بنیاد ڈالی۔ دار المعلومات کی سالانہ رپورٹ اور اس کی لائبریری میں موجود کتابوں کی ۵۶ صفحات پر مشتمل جو خوبصورت فہرست ۱۹۲۴ء میں انجمن پریس ناگپور سے شائع ہوئی ہے، ان کے مطالعے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ ۱۹۲۳ء میں لائبریری میں کتابوں کی تعداد ۲۲۸ تھی جو ۱۹۲۴ء میں بڑھ کر ۴۶۹ ہو گئی تھی۔ اس کے لائبریرین عبدالرشید تھے اور ہر ماہ اوسطاً ۸۰ کتابوں کا اجرا ہوتا تھا۔ جن مصنفین کی جملہ کتابیں اس میں موجود تھیں، ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں : مولانا حالی، مولوی محمد حسین آزاد، مولانا شبلی نعمانی، مولوی ڈپٹی نذیر احمد، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا راشد الخیری، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، نیاز فتحپوری، سر سید احمد خان، خواجہ حسن نظامی مولوی ذکاءاللہ، نواب محسن الملک، جرجی زیدان وغیرہ۔
اس کے ادبی و علمی ذخیرے میں آگے چل کر بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا اور یہ ایک معیاری لائبریری بن گئی تھی لیکن افسوس کہ طالب کی وفات کے بعد یہ لائبریری اجڑ گئی اور اس کا تمام ذخیرہ تباہ و برباد ہو گیا۔

انجمن ضیاء الاسلام :

یہ انجمن عبدالستار فاروقی، مولانا محمد عمر انصاری اطہر، حاجی محمد اسمٰعیل مینیجر، محمد ابو بکر شہرت، ماسٹر نور محمد، محمد صفی اللہ عادل، محمد صغیر، حاجی عبدالوہاب، محمد خورشید حق اور حاجی محی الدین کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہے۔ اس انجمن کے زیر انتظام ۱۹۲۱ء میں ایک لائبریری قائم کی گئی اور اس میں نادر و نایاب کتابیں جمع کی گئیں تاکہ علم و ادب اور تحقیق سے دلچسپی رکھنے والے بہ آسانی فیض حاصل کر سکیں۔ اس کی تعمیر و ترقی میں عبدالستار فاروقی کی بے انتہا کوششیں شامل ہیں۔ وہ اس کے متواتر کئی سال تک صدر رہے۔ اگرچہ یہ لائبریری آج بھی قائم ہے، لیکن اب اس کی وہ امتیازی حیثیت باقی نہیں رہی۔

مدرسہ سراج المومنین :

اس مدرسے کا قیام سردار حاجی سیٹھ عبدالرحمٰن، حاجی ملا عبدالوارث، حافظ محمد داؤد، منشی سعید، عیدو سردار، سیٹھ الٰہی بخش، حاجی عبداللہ، منشی عبدالغفور اور لال محمد کی اجتماعی کوششوں سے عمل میں آیا۔ ان بزرگوں نے ۱۹۱۷ء میں ایک چھوٹے سے مکان میں شبینہ مدرسہ جاری کیا۔ بعد کو جب مدرسہ ترقی پذیر ہوا اور اس میں طلبہ کی تعداد بڑھنے لگی تو ۱۹۱۹ء میں اس کے ذمے داروں نے ایک عمدہ عمارت کی تعمیر کا منصوبہ بنایا، جس کا تکملہ ایک نومسلمہ رحمت بی نے تنِ تنہا کیا۔ اس وقت اس میں دینیات کی تعلیم اعلا سطح تک دی جاتی تھی۔ پھر ۱۹۲۲ء میں سعید کی ایما پر یہاں پرائمری سطح تک اردو و فارسی کی تعلیم کا انتظام کیا گیا۔ یہ سلسلہ کچھ ہی سال جاری رہا۔ یہ مدرسہ آج بھی جاری ہے اور علمِ دین کی خدمت انجام دے رہا ہے۔

انجمن انوارالاسلام :

انجمن ضیاءالاسلام سے ۱۹۲۲ء میں علاحدہ ہوکر محمد خورشید حق نے انجمن انوارالاسلام کے نام سے ایک نئی تنظیم بنائی۔ اس کی نگرانی میں ایک شبینہ مدرسہ جاری ہوا اور ایک لائبریری بھی قائم کی گئی۔ بعد کو انجمن کے ذمے داروں نے علم و ادب کے ساتھ کھیل کود سے بھی دلچسپی لینی شروع کردی۔ یہاں تک کہ اس نام سے ایک فٹ بال کلب کھول لیا، جسے بہت جلد کافی مقبولیت حاصل ہوگئی۔ لیکن اس سے ایک نقصان یہ ہوا کہ تعلیمی اور ادبی سرگرمیاں دھیرے دھیرے ماند پڑتی گئیں، اور پھر نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ لائبریری کو بند کردینا پڑا۔ اسی لائبریری کی کچھ کتابوں سے ایک دوسری لائبریری! انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری کا آغاز ہوا۔

انجمن غنچۂ اسلام :

اس انجمن کا قیام ۱۹۲۲ء میں عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں اور سرپرستوں میں عبدالقادر اخگر، عبدالغفور پٹیل (مالک فرم حاجی وزیر محمد)، سیٹھ حاجی عبدالغفور، محمد مختار، محمد سجاد اور محمد اکبر صوفی کے اسمائے گرامی قابلِ احترام ہیں۔ اس انجمن نے کامٹی کے ادبی ماحول کو فعال اور متحرک بنانے میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس نے ایک لائبریری قائم کی تھی جس میں ادبی، مذہبی اور سیاسی موضوعات پر کئی کتابیں تھیں۔ بعد کو اس انجمن نے بھی کھیل کود، خصوصاً فٹ بال سے دلچسپی لینی شروع کردی جس سے ادبی سرگرمیاں ماند پڑگئیں۔ غنچۂ اسلام کلب کو وسط ہند میں کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری :

اب تک جو ادبی ادارے قائم ہوئے تھے، ان کی سرگرمیاں سرد پڑ چکی تھیں۔ کامٹی کے چند تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اس کا شدید احساس ہوا اور انھوں نے مدرسہ سراج المومنین کے ہال میں سیٹھ محمد احمد (۱۸۸۰ - ۱۹۵۴ء) کی صدارت میں ۱۹ اکتوبر ۱۹۳۶ء کو ایک جلسہ طلب کیا؛ جس میں انجمن اصلاح الانصار کی تشکیل عمل میں آئی۔ محمد ظہیر وارثی اس انجمن کے صدر بنائے گئے اور ماسٹر عبدالحفیظ انصاری ناظم اعلا مقرر ہوئے۔ اس کی نگرانی میں ۴۶ کتابوں سے ایک لائبریری شروع کی گئی؛ جو آج ایک عمدہ کتب خانے کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس میں نادر و نایاب کتابوں کا اچھا خاصا ذخیرہ ہے۔ انجمن کے ذمّے داروں نے نوجوانوں میں شعری، ادبی اور علمی ذوق و شوق پیدا کرنے کے لیے شعبۂ ادب بھی قائم کیا تھا، جس کے کرتا دھرتا ریاض رؤفی اور حمید جمال تھے۔ اس سلسلے میں ۱۹۳۸ء میں ڈاکٹر ذاکر حسین اور ۱۹۴۴ء میں مولانا آزاد سبحانی نوجوانوں سے خطاب کے لیے مدعو کیے گئے تھے۔

یہ انجمن ہر سال اپنی سالانہ رپورٹ چھپواتی ہے۔ اس نے رمضان المبارک اور عیدین کے خطبات بھی شائع کروائے ہیں۔ موجودہ زمانے میں یہ انجمن عبدالرب عرفان، محمد حفظ الرحمٰن اور محمد اسمٰعیل سراج الدین کی کوششوں سے ترقی پذیر رہی ہے۔

آزاد لائبریری :

یہ لائبریری آزادی کے بعد قائم ہوئی۔ اس کے صدر عبدالحفیظ انصاری (ہاکی بیڑی) اور سکریٹری محمد الیاس تھے۔ دیگر اراکین میں مولانا اعجاز،

محمد نذیر، سراج الدین، حافظ عبدالعزیز، محمد اسمٰعیل پہلوان، ملا اسرار الحق، عبدالحق، نیاز پٹیل کے نام نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لائبریری کے زیر اہتمام دو کل ہند مشاعرے بھی ہوئے۔ لیکن ۱۹۵۰ء کا مشاعرہ تاریخی نوعیت کا حامل ہے۔ اس میں جاں نثار اختر، اعجاز صدیقی، فنا نظامی کانپوری، شعری بھوپالی اور دل لکھنوی نے شرکت فرمائی تھی۔ اب اس لائبریری کا خاتمہ ہو چکا ہے۔

بزم غالب :

اس ادارے کا قیام ۱۹۶۷ء میں عمل میں آیا۔ اس کے بانیوں میں یعقوب یزدانی اور ڈاکٹر نظیر رشیدی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ بزم کامٹی میں بے مثال علمی و ادبی کارنامے انجام دے رہی ہے اور اپنے ناقابلِ فراموش کل ہند مشاعروں کے باعث اس علاقے میں بہت مقبول ہو چکی ہے۔ یہ مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکاڈمی کے مالی تعاون سے ایک دارالکتابت بھی چلا رہی ہے۔ اس کا ایک بڑا کارنامہ ادبی موضوعات پر دو روزہ سیمینار کا انعقاد ہے، جو ۳۱ اکتوبر اور یکم نومبر ۱۹۸۱ء کو ربانی جونیئر کالج کے ہال میں ہوا تھا۔ سیمینار کے عنوانات تھے : ودربھ میں اردو ؛ اردو اور مراٹھی کے لسانی اور تہذیبی رشتے ؛ اور اردو مہاراشٹر کی دوسری علاقائی زبان کی حیثیت سے۔ اس میں ودربھ کے نامور ادیبوں کے علاوہ ڈاکٹر عبدالمغنی (پٹنہ)، عبداللطیف اعظمی (دہلی)، مسز فاطمہ انیس (بمبئی)، شرافت علی (گیا، بہار)، عبدالسمیع بوبیرے (بمبئی)، شاہد ندیم (بمبئی)، اور شمیم طارق (بمبئی) نے شرکت کی تھی۔

بزم غالب کے موجودہ عہدیداران واراکین کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

سید قمر الزماں (صدر)، ڈاکٹر محمد یوسف انصاری (نائب صدر)، ڈاکٹر ایس ناتھ

(نائب صدر)، اشوک سنگے وار (نائب صدر)، ڈاکٹر محمد نظیر رشیدی (جنرل سکریٹری)، جمیل حمیدی (نائب سکریٹری)، وکیل احمد انصاری (خزانچی)، محمد حفظ الرحمن (رکن)، کاظم علی (رکن)، وکیل احمد رسول (رکن)، عبدالباری (رکن)، محمد عباس صادق (رکن)، محمد ظہیر الحسن (رکن)، ڈاکٹر مدحت الاختر (رکن)۔

انجمن عصری ادب :

اس انجمن کی بنیاد کامٹی کے چند حوصلہ مند اور نوجوان طلبہ نے ۱۹ نومبر ۱۹۷۹ء کو ڈالی ہے۔ اس کے عہدیداران واراکین کے اسمائے گرامی یہ ہیں : مقبول وارثی (صدر)، غازی شباب احمد (نائب صدر)، شکیل شاہجہاں (نائب صدر)، محمد رفیق اے ایس (ناظم)، نصرت زماں انصاری (نائب ناظم)، محمد شریف روشن (خزانچی)، محمد جابر حلیمی (رکن)، رئیس احمد فیضی (رکن)، فیض محمد (رکن)۔
یہ انجمن نوجوان طلبہ میں علمی وادبی ذوق وشوق اور خصوصاً نثر نگاری کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے اکثر وبیشتر ادبی وشعری نشستوں کا انعقاد کرتی رہتی ہے۔ اس کے زیر اہتمام مدرسہ مدینۃ العلوم املی باغ کامٹی میں فری اردو کوچنگ کلاس اور ایک کتابت سینٹر بغیر کسی سرکاری امداد کے کامیابی سے چل رہا ہے۔ امید ہے کہ نوجوانوں کا یہ جذبہ آئندہ کوئی بڑا کارنامہ انجام دے گا۔

مشاعرے

محفلِ نقشِ سخن کے قیام کے بعد کامٹی میں بہت محدود دائرے میں شعری نشستوں کا آغاز ہوا، جن میں مقامی شعرا کے علاوہ گنے چنے اہلِ ذوق شریک رہا کرتے تھے۔ ان طرحی نشستوں کا انعقاد کسی مکان میں کیا جاتا تھا۔ لیکن جب ۱۹۱۰ء میں تجمل جلالپوری کامٹی تشریف لائے اور یہاں کچھ عرصے مقیم رہے تو، یہی نشستیں مشاعرے میں تبدیل ہوگئیں اور شعرا و خواص کے ساتھ ساتھ عام لوگ بھی مشاعروں سے دلچسپی لینے لگے۔ کامٹی میں پہلا عوامی مشاعرہ 'مشن اسکول' جی این روڈ کے میدان میں تجمل جلالپوری کے اعزاز میں ہوا ہے۔ اس کے بعد تجمل کی موجودگی میں اور بھی کئی مشاعرے ہوئے۔

جب نیا بازار کلب کی ادبی سرگرمیاں بڑھنے لگیں تو اس کے منتظمین نے ۱۹۱۶ء میں ماسٹر شیخ حسین ربانی کی صدارت میں اعلا پیمانے پر ایک عوامی مشاعرے کا انعقاد کیا۔ اس مشاعرے کے لیے یہ طرح مقرر تھی:

نہ قابو میں ہے دل میرا، نہ بس میں ہے زباں میری

اس میں ناگپور کامٹی کے شعرائے کرام نے حصہ لیا تھا۔ دوسرے سال ۱۹۱۷ء میں اسی کلب نے مودی میں ایک اور طرحی مشاعرے کا اہتمام کیا اور

شعرا سے اس مصرع پر طبع آزمائی کی درخواست کی تھی ۔

سرخ مچھلی بن کے تیرے گی چھری جلاد کی

اسی طرح ۱۹۱۹ء میں عبدالرحیم جوہر نے وارث پورہ کامٹی میں ' کلام سہارنپوری کی صدارت میں ایک عالیشان طرحی مشاعرہ کروایا ۔ طرح تھی :

جناب قیس کب سینے میں اپنے دل سمجھتے ہیں

اسی مشاعرے سے کلام سہارنپوری اور مولانا ناطق گلاؤٹھوی کے درمیان شاعرانہ چشمک کا آغاز ہوا اور آگے چل کر اس نے اتنی شدت اختیار کرلی کہ مقامی شعرا دو حصوں میں بٹ گئے ۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ان اختلافات سے ناگپور و کامٹی میں شاعری کو خوب تقویت پہنچی ۔ یہیں سے مشاعرے کامٹی کی تہذیبی روایت بنتے چلے گئے اور پھر اس کثرت سے مشاعرے ہونے لگے کہ ان سب پر تفصیل سے روشنی ڈالنا ممکن نہیں ہے ؛ لہٰذا چند اہم مشاعروں کی مختصر رپورٹ درج کی جاتی ہے ۔

نیا بازار کلب کے آل سی پی اینڈ برار مشاعرے جو مسلسل تین سال (۱۹۲۱ء تا ۱۹۲۳ء) تک کامٹی میں ہوئے ہیں ؛ ادبی لحاظ سے کافی اہمیت رکھتے ہیں ۔ ان مشاعروں کی مجلس استقبالیہ کے صدر ماسٹر شیخ حسین ربانی اور سکریٹری محمد رستم احقر تھے ۔ پہلا مشاعرہ عبدالحمید خان زیبا کوٹی بی اے کی صدارت میں ربانی اسکول کے احاطے میں ہوا تھا ۔ اس میں یہ مصرع طرح دیا گیا تھا :

دل تڑپتا ہے تو بیتاب جگر ہوتا ہے

دوسرا مشاعرہ ۱۹۲۲ء میں مولانا ناطق گلاؤٹھوی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا ۔ اس میں دو طرحیں مقرر تھیں :

حرم میں بیٹھ کر ہوتا تھا کب ذکر بتاں پہلے

کمبخت یاد آتے ہیں قصّے شباب کے

اور تیسرا مشاعرہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو مولانا علیم اللہ خیالی برہان پوری کی صدارت میں ان طرحوں پر ہوا تھا :

ان کو آنا چاہیے خط کا جواب آیا تو کیا

ترستا تھا بڑی مدت سے یہ ناسور مرہم کو

اس میں مولانا خیالی نے عالمانہ خطبۂ صدارت بھی پڑھا تھا، جو مشاعرے کی تفصیلی روداد کے ساتھ ماہنامہ شاعر، آگرہ کے مشاعرہ نمبر (نومبر دسمبر ۱۹۳۳ء) میں چھپ چکا ہے۔

آزادی کے بعد، ۲۸ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو حمید ناگپوری کی صدارت میں جو مشاعرہ ہوا تھا؛ اس کی رپورٹ نصیر عظیمی نے مرتب کر کے چھپوادی ہے۔ اس میں جو شعرا شریک تھے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں : انور کامٹوی، طرفہ قریشی، یاور رائے پوری، شاطر حکیمی، سوز خفرائی، آذر سیمابی، منظر کامٹوی، فنا حیدرآبادی، ساقی جاوید، واقف برہانپوری، رواں جونپوری، راغب کامٹوی جلیل عرشی، عزیز قدوسی وغیرہ۔

جوہر ڈے کے طرحی مشاعرے بھی ادبی اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مشاعرے آزادی کے بعد متواتر کئی سال تک صدیق اختر بڈھب کی کوششوں سے محمد علی گنج کامٹی میں ہوتے رہے ہیں۔ یہاں اس حقیقت کا اعتراف ضروری ہے کہ ان مشاعروں نے کامٹی میں شعر و شاعری کی ترویج و ترقی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔ اس کے ایک مشاعرے کی رپورٹ نذر ادب کے نام سے اپنا کتاب گھر کامٹی نے شائع کی ہے۔ یہ مشاعرہ ۹ ستمبر ۱۹۵۶ء کو ممتاز خوشتر کھنڈوی کی صدارت میں ہوا ہے۔

اسی طرح بزم ادب کامٹی کے طرحی مشاعرے بھی قابل ذکر ہیں، جو متواتر ۱۷ سال تک پیلی حویلی کامٹی میں منعقد ہوتے رہے ہیں۔

جب بزم غالب نے کل ہند مشاعروں کے انعقاد کا بیڑا اٹھایا تو کامٹی کے

دیگر مشاعرے اس کی عظمت اور شان و شوکت سے دب کر رہ گئے اور ان مشاعروں نے وسطِ ہند میں بے پناہ مقبولیت حاصل کر لی۔ اس بزم کا پہلا مشاعرہ عبدالرحمٰن اخضر کی یاد میں ۱۹۶۷ء میں مردان علی خاں نشاط کی صدارت میں محمد علی گنج گجری بازار کامٹی میں ہوا۔ اس میں مقامی شعرا کے علاوہ شعری بھوپالی، اکرم دھولیوی، اختر نظمی اور بسمل شاہجہاں پوری وغیرہم شریک تھے۔

دوسرا مشاعرہ بھی اخضر مرحوم کی یاد میں ۲ نومبر ۱۹۶۸ء کو ڈاکٹر ایل سی رندھیر کی صدارت میں اسی مقام پر ہوا۔ اس مشاعرے کے لیے مندرجہ ذیل طرحیں مقرر تھیں :

اے جنوں آج یہ صحرا ترے سر ہوتا ہے — اخضر
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے — فانی

اس میں مقامی شعرا کے علاوہ فنا نظامی کانپوری، بسمل شاہجہانپوری، شمسی مینائی، شعری بھوپالی، کاشف اندوری، حیات وادثی، سالک لکھنوی، وقار واثقی، اختر نظمی جیسے ممتاز شعرا نے شرکت فرمائی تھی۔

تیسرا مشاعرہ غالب صدی کے موقع پر، کرنل جی ایس چوپڑا کی صدارت میں یکم نومبر ۱۹۶۹ء کو ہوا تھا۔ اس میں شمیم کرہانی، جگر گورکھپوری، بیکل اتساہی، اجمل سلطانپوری، انور مرزاپوری، شمسی مینائی اور ماہر لکھنوی شریک تھے۔ نظامت کے فرائض عمر قریشی نے انجام دیے تھے۔ اس موقع پر ایک خوبصورت سووینیر بھی شائع ہوا تھا، جس میں مشاعرے میں شریک تمام شعرا کا کلام شامل ہے۔ اس مشاعرے کو آکاش وانی ناگپور نے براہِ راست نشر کیا تھا۔

چوتھا مشاعرہ ۱۹ دسمبر ۱۹۷۰ء کو نذیر بنارسی کی صدارت میں ہوا۔ اس میں

شریک ہونیوالے بیرونی شعرا کے اسمائے گرامی یہ ہیں : کرشن بہاری نور، زبیر رضوی، اجمل سلطانپوری، آفتاب لکھنوی، حیات وارثی، عیش کنول، تسنیم فاروقی، ہلال سیوہاروی وغیرہ۔

پانچواں مشاعرہ ڈاکٹر ایل سی رندھیر کی صدارت میں ۲۷ نومبر ۱۹۷۱ء کو منعقد ہوا تھا۔ اس میں ایاز جھانسوی، پورن کمار ہوش، تسنیم فاروقی، تبسم دہلوی وغیرہ شریک تھے۔ اس موقع پر ایک سوونیر بھی چھپا تھا۔

چھٹا مشاعرہ یکم فروری ۱۹۷۵ء کو گرونانک کی یاد میں ہوا تھا۔ اس کا افتتاح ڈاکٹر خلیق انجم جنرل سکریٹری انجمن ترقی ہند نے کیا تھا اور صدارت کے فرائض ڈاکٹر ایل سی رندھیر نے انجام دیے تھے۔ اس میں مقامی شعرا کے علاوہ سلیمان خطیب، آفتاب لکھنوی، مخمور سعیدی، اقبال مجید، عالم فتح پوری، دبیر سیتاپوری، نیر اعظمی، سلیم شیرازی موجود تھے۔

ساتواں مشاعرہ ڈاکٹر اقبال کی صد سالہ برسی کے موقع پر ۸ اپریل ۱۹۷۸ء کو ہوا۔ اس میں حق کانپوری، طارق ایرانی، انور جلال پوری، سوز سکندرپوری، مذاق چرکھاروی، وسیم بریلوی وغیرہم شریک تھے۔ علامہ اقبال کی یاد میں سوونیر بھی شائع ہوا تھا۔

اس طرح بزم غالب کے زیر اہتمام سات عظیم الشان کل ہند مشاعرے ہوئے۔ جو سامعین کی کثیر تعداد اور حسنِ انتظام کے لحاظ سے تاریخی حیثیت رکھتے ہیں۔

کتابیات :

ارمغانِ جدید	سعید کامٹوی	۱۸۹۵ء	انوار محمدی پریس، لکھنؤ
ارتکاز	عبدالرحیم نشتر	۱۹۷۱ء	رنجیت آرٹس، ناگپور
اسلامی ادبیات پر ایران کا اثر	عبدالستار فاروقی	۱۹۷۴ء	نظامی پریس، لکھنؤ
آسان درسِ قرآن	حافظ محمد یعقوب	۱۹۵۸ء	اسرار کریمی پریس، الہ آباد
اعراف	عبدالرحیم نشتر	۱۹۷۲ء	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی
انجمن	نصیر عظیمی	۱۹۴۹ء	علوی پریس، بھوپال
انکشاف	مولانا اطہر	۱۹۳۷ء	الفاروق پریس، کامٹی
بھوپال ایک خواب	عبدالرحیم نشتر	۱۹۷۷ء	فاطمی آرٹ پرنٹرس، ناگپور
تجلیاتِ انور	مولانا انور	۱۹۷۱ء	انصاری آرٹس، ناگپور
تلخیات	نواب غازی		الفاروق پریس، کامٹی
چاروں اور	شاہد کبیر، مدحت الاختر	۱۹۶۸ء	مدھوکر آرٹس، ناگپور
حالات مومن پنچ	محمد نور الحسن صادق	۱۹۳۷ء	الفاروق پریس، کامٹی
خطبہ عید الفطر	حافظ محمد یعقوب		الفاروق پریس، کامٹی
ستارے اور سیارے	جلیل عرشی	۱۹۶۲ء	دین دیال پریس، دہلی
شامِ گراں	عبدالرحیم نشتر	۱۹۷۸ء	فاطمی آرٹ پرنٹرس، ناگپور

طورِ رخشاں	طرفہ قریشی	۱۹۴۷ء	مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد
فروغِ جاوید	سعید کامٹوی	۱۸۹۰ء	مطبع کریمی، بمبئی
قوم کی خدمت میں	طالب الدین طالب	۱۹۱۷ء	انجمن اسلامیہ، جبلپور
کتاب شناسی	ظ۔ انصاری	۱۹۸۲ء	یونیورسل پریس، بمبئی
گلستانِ معرفت	نواب غازی	۱۹۳۲ء	محبوب المطابع برقی پریس دہلی
منافقوں میں روز و شب	مدحت الاختر	۱۹۸۰ء	فاطمی آرٹ پرنٹرس، ناگپور
موت و حیات	شاطر حکیمی	۱۹۴۴ء	مطبع ابراہیمیہ، حیدرآباد
نظائر سلوک	صوفی عبدالحکیم		ابوالعلائی پریس، آگرہ
نذرِ ادب		۱۹۵۶	اپنا کتاب گھر، کامٹی

An Advance History of India by Majumdar

Nagpur Residency Record, Vol. IV by H.N. Sinha

مخطوطات:

اردو غزل کا طویل ارتقائی سفر	طاہرہ بانو
اردو ادب میں پیروڈی	عبدالرحیم نشتر
بیاضِ اخضر	عبدالقادر اخضر
بیاضِ شہرت	ابوبکر شہرت
بیاضِ انجم	نیاز انجم
بیاضِ عادل	صفی اللہ عادل
بیاضِ ناظم	فقیر محمد ناظم
تلوک چند محروم، حیات اور کارنامے	محمد یوسف انصاری
دیوانِ حافظ	محمد عبداللہ حافظ

شبلی نعمانی کی سیرت نگاری — ارشد جمال
صالحہ عابد حسین، حیات اور ادبی کارنامے — جاوید احمد سعیدی
مولوی غلام علی آزاد بلگرامی — محمد اصغر عثمانی
نیاز فتح پوری، حیات، شخصیت اور کارنامے — نظیر رشیدی
نعمت خان عالی، شخصیت، فن اور کارنامے — عبدالرب عرفان
نظیری نیشاپوری، حیات اور فن — مدحت الاختر
ودربھ میں جدید شاعری — عبدالرحیم نشتر
ہدایت الطالبین — صوفی عبدالحکیم

جرائد و رسائل :

الفاروق — ہفتہ وار کامٹی — ۲۴ مئی ۱۹۴۸ء، ۲۰ مارچ ۱۹۵۰ء
انقلاب — روزنامہ بمبئی — ۱۱ اگست ۱۹۷۶ء
الہلال — ماہنامہ دہلی — دسمبر ۱۹۲۳ء
آجکل — ماہنامہ دہلی — اکتوبر ۱۹۵۷ء
جہد پیہم — (سووینر مشاعرہ ینگ مسلم فٹ بال کلب ناگپور)
جلوۂ یار — ماہنامہ میرٹھ — جون ۱۹۰۹ء جون ۱۹۱۰ء
جولائی اگست ۱۹۱۰ء،
اکتوبر نومبر ۱۹۱۰ء دسمبر ۱۹۱۰ء
جنوری ۱۹۱۱ء، فروری ۱۹۱۲ء
جون جولائی ۱۹۱۲ء، اگست ۱۹۱۲ء
جنوری ۱۹۱۳ء، اپریل ۱۹۱۴ء

		مئی ۱۹۱۴ء، اگست ۱۹۱۴ء
		اپریل ۱۹۱۵ء، جون ۱۹۱۵ء
		جولائی ۱۹۱۵ء نومبر دسمبر ۱۹۱۵ء
		جنوری ۱۹۱۶ء، فروری مارچ ۱۹۱۶ء
		اپریل ۱۹۱۶ء، اگست ستمبر ۱۹۱۶ء
		مارچ ۱۹۱۸ء، اکتوبر ۱۹۱۸ء
		فروری ۱۹۱۹ء، مارچ ۱۹۱۹ء
		اپریل ۱۹۱۹ء، اگست ۱۹۲۰ء
		جولائی ۱۹۲۱ء
خیال	ماہنامہ کامٹی	مئی جون ۱۹۵۷ء، مارچ ۱۹۵۹ء
		جنوری ۱۹۶۱ء
درِ سخن	ماہنامہ کامٹی	مارچ ۱۹۳۵ء، اپریل ۱۹۳۵ء
سفینۂ نجات	ماہنامہ دہلی	مارچ ۱۹۰۲ء، جون ۱۹۰۲ء
		جولائی ۱۹۰۲ء، اگست ۱۹۰۲ء
		ستمبر ۱۹۰۲ء، نومبر ۱۹۰۲ء
شاعر	ماہنامہ آگرہ	نومبر دسمبر ۱۹۳۲ء، جولائی ۱۹۳۳ء
		نومبر دسمبر ۱۹۳۳ء،
		جولائی اگست ۱۹۳۴ء،
		نومبر دسمبر ۱۹۳۴ء، مارچ ۱۹۳۶ء
		مئی ۱۹۳۶ء، ستمبر ۱۹۳۶ء
		جولائی ۱۹۳۷ء،
		اکتوبر ۱۹۳۷ء، نومبر ۱۹۳۷ء
		فروری ۱۹۳۸ء، جون ۱۹۳۸ء

مجلہ علم و عرفان	جولائی ۱۹۳۸ء، اگست ۱۹۳۸ء اکتوبر ۱۹۴۴ء دستوویز (انجمن اصلاح الانصار پبلک لائبریری، کامٹی) ۱۹۸۰ء

نوٹ :

صفحہ نمبر ۱۲۹ کے دوسرے پیرگراف کی ابتدائی سطروں کو اس طرح پڑھا جائے :

شمس ۲۸ مئی ۱۹۲۸ء کو کامٹی میں پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن اور نوجوانی کے ایام راج ناند گاؤں (چھتیس گڑھ) میں گزرے، جہاں ان کے والد بسلسلۂ امامت سکونت پذیر تھے۔ انھوں نے ابتدائی اور ثانوی تعلیم بھی وہیں حاصل کی۔ جب ....

۱۸۵ء کی جنگِ آزادی کی حشر سامانیوں
ے متاثر ہو کر یوپی کے بے شمار خاندانوں نے
ب وطن ہی میں عافیت سمجھی اور قافلہ
قافلہ وسطِ ہند کا رُخ کیا
ھی میں سے کچھ لوگ کامٹی میں آباد
ئے اور ان کی آمد کے ساتھ ہی
اں اردو شعر و سخن کی روایت کا
از ہوا۔ چونکہ کئی پشتیں گزر
نے کے بعد بھی آج کے بیشتر
عرا و ادبا اسی سرزمین سے تعلق
ھتے ہیں، اِس لحاظ سے انھیں
ی سے "دور کی نسبت" ہے۔
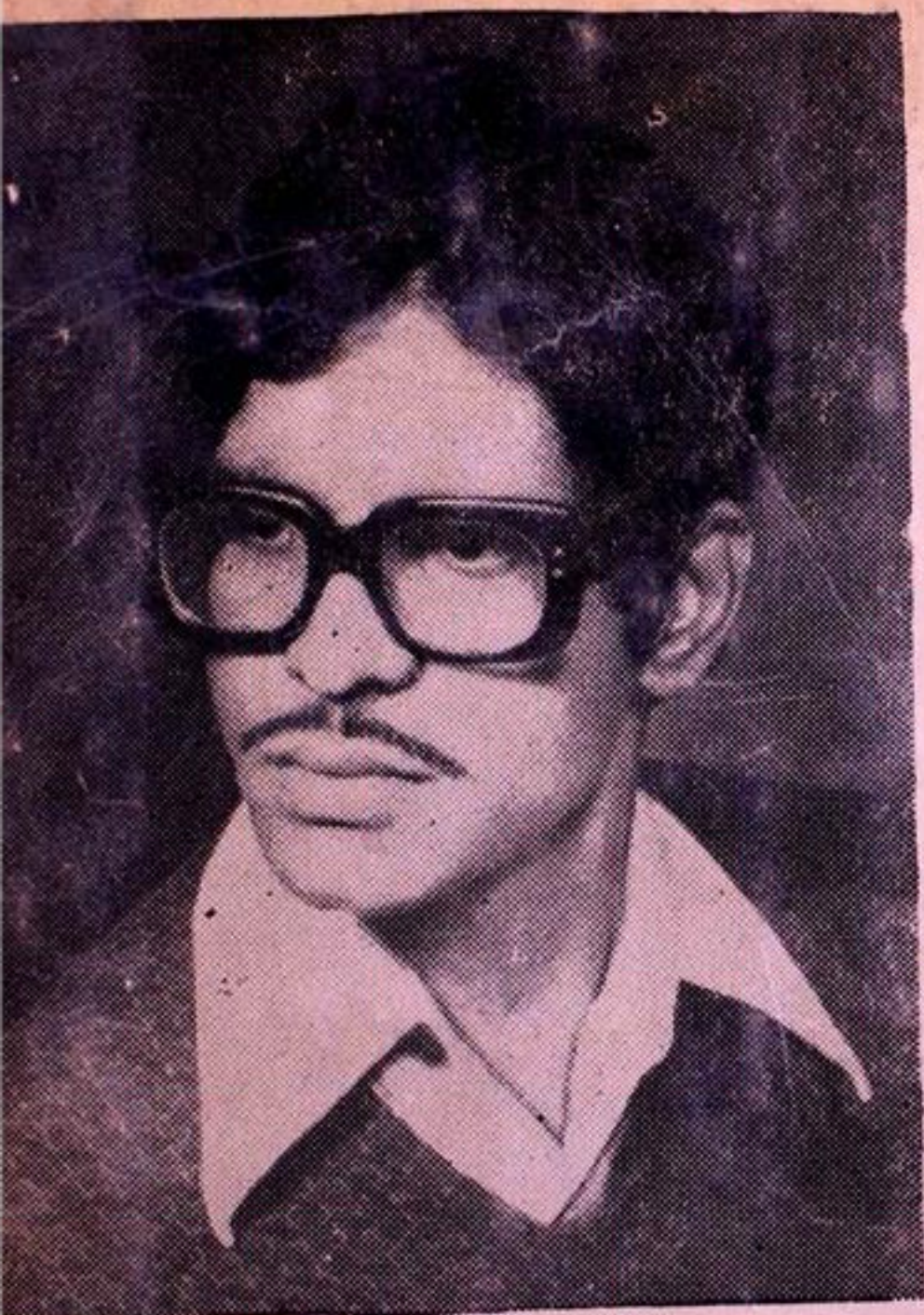
یہ کتاب کامٹی کے
عروں، ادیبوں، صحافیوں اور علمی و ادبی انجمنوں کا ایک ایسا آئینہ خانہ ہے
ں میں اردو کی تہذیبی، علمی اور ادبی روایات پوری تابناکی کے ساتھ عکس
ہیں۔ اِس پہلو کے پیشِ نظر اس کو تاریخِ ادبِ اردو کی ایک بھولی بسری کڑی
نا چاہیے۔

ڈاکٹر محمد شرف الدین نے جس خلوص، محنت اور نیک نیتی کے جذبے کے تحت
کتاب لکھی ہے، خدا کرے اسی جذبے کے ساتھ اس کی پذیرائی بھی ہو۔

محمد حفظ الرحمٰن
معلّم ربانی جونیر کالج کامٹی